الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

آدمی کی بے صبری اس کے دشمن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے
سب سے زیادہ نادان وہ ہے ——————
جو خود اپنی طرف سے دشمن کو یہ ہتھیار فراہم کر دے

شمارہ ۵۶
جولائی ۱۹۸۱

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

جولائی ۱۹۸۱
شمارہ ۵۶

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

بسم [redacted]

اعلان

اس سے پہلے اعلان کیا گیا تھا کہ ماہنامہ الرسالہ مستقل طور پر خسارہ میں چل رہا ہے، الرسالہ کے ہمدرد اصحاب اپنے تعاون سے اس کی تلافی فرمائیں۔ مگر ابھی تک اس سلسلہ میں ہم کو خاطر خواہ تعاون حاصل نہ ہو سکا۔

اب یہ آخری بار اعلان کیا جا رہا ہے۔ ہماری انتہائی کوشش ہے کہ الرسالہ کی قیمت میں اضافہ کئے بغیر اس کو جاری رکھا جا سکے۔ تاہم اگر اس اعلان کے بعد بھی لوگوں کا تعاون ہم کو نہیں ملا تو آئندہ الرسالہ کی قیمت بڑھا کر تین روپیہ فی شمارہ کر دی جائے گی۔

واضح ہو کہ الرسالہ کے نقصان کی تلافی کے لئے عام تعاون کے علاوہ زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں بھی دی جا سکتی ہیں۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں۔ ہر خط و کتابت کے ساتھ خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں

دریافت کی لذت

سورج ہماری زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا اور اس سے ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے۔ پھر بھی سورج کی روشنی اور حرارت بے پناہ مقدار میں ہم تک پہنچ رہی ہے۔ یہ سورج کائنات کا نسبتاً ایک چھوٹا ستارہ ہے جو قریب ہونے کی وجہ سے ہم کو بڑا دکھائی دیتا ہے۔ اکثر ستارے سورج سے بہت زیادہ بڑے ہیں اور اس سے بہت زیادہ روشن بھی۔ روشنی اور حرارت کی یہ عظیم دنیائیں جن کو ستارہ کہا جاتا ہے بے شمار تعداد میں خلا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کھرب ہا کھرب سال سے دہکنے کے باوجود ان کا حرارتی بھنڈار ختم نہیں ہوتا۔

ستاروں میں یہ بے پناہ قوت (Energy) کیسے پیدا ہوتی ہے۔ ہنس بیٹے (Hans Bethe) نے فلکیاتی طبیعیات کے میدان میں لمبی تحقیق کے بعد بتایا کہ اس کا راز کاربن سائیکل (Carbon Cycle) ہے۔ اسی تحقیق پر ۱۹۶۷ میں موصوف کو طبیعیات کا نوبل انعام دیا گیا۔

ڈاکٹر بیٹے (پیدائش ۱۹۰۶) نے جس دن کاربن سائیکل کی یہ سائنسی دریافت کی، وہ ان کے لئے جوش و مسرت کا ایک ناقابلِ بیان لمحہ تھا۔ ان کی بیوی روز بیٹے (Rose Bethe) کہتی ہیں کہ رات کا وقت تھا۔ ہم نیو میکسیکو کے صحرا میں تھے۔ صحرائی ماحول میں آسمان کے ستارے عجیب شان کے ساتھ چمک رہے تھے۔ روز بیٹے نے اوپر نگاہ کی اور حیران ہو کر کہا "آکاش کے ستارے کتنا زیادہ چمک رہے ہیں" ڈاکٹر بیٹے نے جواب دیا: کیا تم کو خبر ہے کہ اِس وقت تم اس واحد انسان کے عین قریب کھڑی ہو جو یہ جانتا ہے کہ یہ ستارے آخر چمکتے کیوں ہیں۔

Do you realize, just now you are standing next to the only human who knows why they shine at all.

ہنس بیٹے کی دریافت اصل حقیقت کا بے حد جزئی پہلو تھا۔ اس نے ستاروں میں کاربن سائیکل کا عمل دریافت کیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ خود کاربن سائیکل کا عمل ستاروں میں کیوں ہے۔ اس عظیم تر راز کو مومن خدا کی صورت میں دریافت کرتا ہے۔ ایمان باللہ ایک دریافت (Discovery) ہے جو تمام دریافتوں سے زیادہ بڑی ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ سائنس داں کو معمولی دریافت ہوتی ہے تو وہ وفورِ جذبات سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ مگر ایمان والے سب سے بڑی چیز ــــ خدا کو دریافت کرتے ہیں اور ان کے اندر کوئی جذباتی ابال پیدا نہیں ہوتا۔ شاید خدا پر ایمان کے دعوے داروں نے ابھی تک خدا کو دریافت نہیں کیا۔

سب کچھ عجیب ہے

۱۹۵۷ میں روس نے پہلا اسپٹنک خلا میں بھیجا تھا۔ امریکہ نے ۱۲ اپریل ۱۹۸۱ کو پہلی خلائی بس (کولمبیا) دو آدمیوں کے ساتھ بھیجی۔ وہ اس طرح بنائی گئی ہے کہ تقریباً سو بار خلائی سفر کے لئے استعمال ہو سکتی ہے

کولمبیا کا وزن ۵ ۷ ٹن ہے۔ اس کے بنانے میں تقریباً دس ارب ڈالر خرچ ہوئے ہیں اور وہ نو سال میں بن کر تیار ہوئی ہے۔ کولمبیا اپنے دو مسافروں کو لے کر خلا میں روانہ ہوئی۔ اس کی رفتار ۲۶ ہزار میل فی گھنٹہ تھی۔ وہ ۵۴ گھنٹہ خلا میں رہی۔ اس نے زمین کے گرد ۳۶ چکر لگا کر ۱۰ لاکھ میل طے کئے اور پھر ۱۴ اپریل کو واپس آگئی۔ واپسی کے وقت مخصوص راڈ اور راکٹوں کے ذریعہ اس کی رفتار کو گھٹا کر ۳۴۵ کیلو میٹر فی گھنٹہ کیا گیا۔ جب وہ ہوائی کرہ میں داخل ہوئی تو ہوا کی رگڑ سے گرم ہو کر سرخ اینٹ کی مانند ہو گئی۔ اس وقت اس کا بیرونی درجہ حرارت ۱۱۵۰ درجہ سنٹی گریڈ تھا۔ مگر کولمبیا کے بیرونی سمتوں میں ہر طرف گرمی روکنے والے ٹائل ۳۱ ہزار کی تعداد میں لگائے گئے تھے اس کی وجہ سے اس کے اندر کے دونوں مسافر محفوظ رہے۔

کولمبیا کو امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کے صحرا میں ایک ہوائی میدان میں اتارا گیا۔ وہ صرف ۱۰ سکنڈ کے فرق سے اپنے ٹھیک وقت پر اتر گئی۔ تقریباً دو لاکھ آدمی اس کے اترنے کا منظر دیکھنے کے لئے وہاں جمع تھے۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں کے کروڑوں آدمیوں نے اس واقعہ کو ٹیلی وژن پر دیکھا۔ کیلی فورنیا کے صحرا میں ۲۰ ٹرک اور کئی ہوائی جہاز اور دوسرے سامان موجود تھے تاکہ اترنے کے بعد وہ کولمبیا کی ہر ضرورت کو پورا کر سکیں۔ کولمبیا راکٹ کی طرح عمودی شکل میں اوپر گئی۔ وہ ایک تابع سیارہ کی طرح زمین کے گرد گھومی اور پھر گلائڈر (ہوائی جہاز) کی طرح زمین پر اتر آئی۔

کولمبیا کے دو مسافروں میں سے ایک مسٹر ینگ (John Young) تھے۔ ان کی عمر اس وقت ۵۰ سال ہے۔ ۵۴ گھنٹہ بے وزنی کی حالت میں رہنے کے بعد جب وہ اس حیران کن خلائی سفر سے واپس کیلی فورنیا پہنچے تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا ——— کیسا عجیب ہے اس طرح سے کیلی فورنیا آنا:

What a way to come to California

مسٹر ینگ خلائی سفر طے کر کے کولمبیا کے ذریعہ کیلی فورنیا میں اترے تو یہ بات ان کو بہت عجیب معلوم ہوئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز عجیب ہے۔ کوئی سفر خواہ پیدل ہو یا سواری کے ذریعہ ہو، اس میں اتنے بے شمار کائناتی اسباب شامل ہوتے ہیں کہ آدمی ان کے بارے میں سوچے تو معمولی سفر بھی اس کو ایسا حیران کن معلوم ہو کہ وہ پکار اٹھے: میرا اپنے پیروں سے چل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا بھی اتنا ہی عجیب ہے جتنا کولمبیا کے ذریعہ خلائی سفر طے کر کے کیلی فورنیا کے صحرا میں اترنا۔ عام آدمی صرف کسی انوکھے واقعہ کے عجوبہ کو دیکھ پاتا ہے، عقلمند وہ ہے جو معمولی واقعات میں بھی اسی عجوبہ کو دیکھ لے۔

ماضی اور حال

اسکاٹ لینڈ کا ایک نوجوان اپنے ملک سے نکل کر ۱۲۱۷ء میں اسپین آیا۔ اس کا نام مائیکل (Michael) تھا۔ اس کا مقصد طلیطلہ اور قرطبہ کے عرب علمی مراکز میں تعلیم حاصل کرنا تھا۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ لاتینی یورپ کو ارسطو سے واقف کرائے۔ یونانی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ اصل یونانی متن سے اس کا ترجمہ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا لاتینی ترجمہ عربی ترجمہ کی مدد سے کیا۔ اسپین کے قیام کے دوران وہ عربی زبان بخوبی سیکھ چکا تھا۔

۱۲۳۱ء میں سلرنو (سسلی) میں پہلا طبی کالج کھولا گیا۔ اس طبی کالج کے نصاب کے لئے ڈنمارک کے ہنڈرک (Hendrink Harpestraeng) نے سات جلدوں میں ایک کتاب تیار کی تھی جو اب بھی اسٹاک ہام کی نیشنل لائبریری میں محفوظ ہے۔ ہنڈرک کا ماخذ بھی مذکورہ مائیکل کا وہی ترجمہ تھا جو اس نے الرازی اور ابن سینا کی طبی کتابوں کا عربی سے لاتینی زبان میں کیا تھا۔

جارج سارٹن (George Sarton) نے پانچ جلدوں میں سائنس کی تاریخ (History of Science) لکھی ہے۔ اس نے سائنس کی تاریخ کو چند ادوار پر تقسیم کیا ہے۔ اس کی تقسیم کے مطابق ہر دور نصف صدی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر نصف صدی کے دور کو وہ ایک مرکزی شخصیت سے متعلق قرار دیتا ہے۔ اس طرح ۴۵۰ تا ۴۰۰ قبل مسیح کو سارٹن افلاطون کا دور قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد کے ادوار کو وہ ارسطو، اقلیدس اور ارشمیدس کا دور کہتا ہے، وغیرہ۔ پھر ۶۰۰ سے لے کر ۷۰۰ء تک کے زمانہ کو اس نے چینی علماء کا دور قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ۷۵۰ سے لے کر ۱۱۰۰ء تک اس کی تقسیم کے مطابق مسلسل جابر، خوارزمی، رازی، مسعودی، بیرونی، ابن سینا، ابن الہیثم اور عمر خیام کا دور ہے۔ یہ سب کے سب عرب، ترک، افغانی اور ایرانی مسلمان تھے۔ سارٹن کے نزدیک تاریخ سائنس میں ساڑھے تین سو سال تک بلا انقطاع صرف مسلم سائنس دانوں کا دور رہا ہے۔ جارج سارٹن کی تقسیم کے مطابق ۱۱۰۰ء کے بعد پہلی بار مغربی اشخاص کا نام سائنس کی دنیا میں آنا شروع ہوتا ہے۔ مثلاً گیرارڈ، راجر بیکن۔ تاہم اس کے بعد بھی ۲۵۰ سال تک ابن رشد، نصیر الدین طوسی اور ابن نفیس کا ذہنی غلبہ یورپ پر قائم رہا۔ ابن نفیس وہ شخص ہے جس نے پہلی بار جسم کے اندر دوران خون کا امکان ظاہر کیا تھا، بعد کو ہاروے نے اسے دریافت کیا۔ اس طرح گویا سائنس کی تاریخ میں مسلسل چھ سو سال ایسے ہیں جب کہ مسلمانوں کو دنیا کی علمی قیادت حاصل رہی ہے۔

۱۳۵۰ کے بعد مسلم دنیا نے اپنا علمی برتری کا مقام کھو دیا۔ تیمور کے پوتے الغ بیگ کے سمرقند کے

دربار میں ۱۴۳۷ میں اور مغل شہنشاہ دہلی کے دربار میں ۱۷۲۰ میں کچھ علمی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مگر مسلم دنیا کا علمی زوال بدستور جاری رہا۔ اس کے لئے دوبارہ اپنے ماضی کی طرف واپس جانا ممکن نہ ہو سکا۔ موجودہ زمانہ میں تاریخ کے پہیہ نے الٹے رخ پر سفر شروع کیا ہے۔ پہلے مغرب کے لوگ مسلم دنیا میں علم سیکھنے کے لئے آتے تھے، اب مسلمان علم سیکھنے کے لئے مغربی دنیا میں جا رہے ہیں۔ تاہم موجودہ زمانہ میں مسلمان مغرب کے تہذیبی مقلد تو بنے ہیں، وہ ان کے علمی ہم سر ابھی تک نہ ہو سکے۔

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام نے ۱۰ نومبر ۱۹۸۰ کو یونسکو کے زیر انتظام بلگریڈ کے اجتماع میں تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے ایک واقعہ بتایا۔ کسی مغربی سائنس داں سے گفتگو کے دوران انھوں نے شکایت کی کہ مغربی ممالک مسلم ممالک کی سائنسی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے کافی مدد نہیں کرتے۔ مغربی سائنسداں نے اس کے جواب میں کہا: سلام، کیا واقعۃً تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان قوموں کو سنبھالیں۔ ان کو مدد دیں، انھیں زندہ رکھیں جنھوں نے انسان کے علمی خزانہ میں ایک ذرہ برابر بھی کوئی تخلیق یا اضافہ نہیں کیا ہے:

> Salam, do you really think we have an obligation to succour, aid and keep alive those nations, who have never created or added an iota to man's stock of knowledge.

ڈاکٹر عبدالسلام اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میرے دل کو اس وقت شدید جھٹکا لگتا ہے جب میں جدید طرز کے ایک اسپتال میں داخل ہوتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ پنسلین سے لے کر زندگی کو بچانے والے دوسرے طبی سامان جو وہاں ہیں ان میں سے کسی چیز کی دریافت یا ترقی میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو ہم کسی طرح یہ امید نہیں کر سکتے کہ دوسروں کی مدد ہمیں جدید دنیا کی ترقی یافتہ قوم بنا سکتی ہے۔ جو قوم دنیا کو کچھ نہ دے رہی ہو اس کو یہ امید بھی نہ کرنی چاہئے کہ دنیا اسے کوئی چیز دے گی۔

مسلم قوموں کے لئے واحد راستہ یہ ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں خود اپنی کوشش سے آگے بڑھیں۔ عربوں کی بے پناہ دولت بھی اس معاملہ میں ذاتی کوشش کا بدل نہیں بن سکتی۔ آج مسلم ممالک بڑے پیمانہ پر مشینیں اور ہتھیار مغربی ممالک سے درآمد کر رہے ہیں مگر اس قسم کی مشینی درآمد ان کے اصل مسئلہ کا حل نہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے فنی بنیاد (Technical Base) کی ضرورت ہے اور وہ کسی مسلم ملک کے پاس موجود نہیں۔ ایک سائنس داں نے بجا طور پر کہا ہے کہ تمام بنیادی علوم ایک دوسرے سے متعلق علوم ہیں:

All basic science is relevant science

حقیقت یہ ہے کہ تمام علوم میں دستگاہ حاصل کرنے کے بعد ہی کوئی قوم ترقی کر سکتی ہے نہ کہ محض چند علوم میں۔

دونوں ایک سطح پر

۳۱ مارچ ۱۹۸۱ کو تمام دنیا کے اخبارات کی پہلی سرخی یہ تھی "صدر امریکہ پر قاتلانہ حملہ"۔ ایک نوجوان نے خودکار گن سے صدر رونالڈ ریگن پر حملہ کیا اور دو سکنڈ میں چھ فائر کئے۔ ایک گولی صدر کے سینہ کو چھید کر ان کے پھیپھڑے میں لگی۔ اسپتال تک پہنچتے پہنچتے ان کے جسم کا آدھا خون بہہ چکا تھا۔ مگر فوری طبی مدد کارگر ثابت ہوئی اور رونالڈ ریگن کی جان بچ گئی۔

رونالڈ ریگن اس سے پہلے ایک فلم ایکٹر تھے۔ فلم کی دنیا میں وہ کوئی ممتاز مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور بالآخر ۱۹۸۰ کے الکشن میں امریکہ کے صدر منتخب ہو گئے۔ گولی لگنے کے بعد صدر ریگن نے واشنگٹن کے اسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں سے بات کرتے ہوئے کہا:

If I'd got this much attention in Hollywood, I would never have left

اگر میں ہالی وڈ (فلمی دنیا) میں اتنی زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہوتا تو میں فلمی دنیا کو کبھی نہ چھوڑتا (ہندستان ٹائمس یکم اپریل ۱۹۸۱) دوسری طرف نوجوان حملہ آور جان ہنکلے (John Hinckley) کی روداد کے ذیل میں آیا ہے کہ اس کو نوجوان فلم ایکٹرس جاڈی فاسٹر (Jodie Foster) سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اس کو خطوط لکھتا رہا مگر مس فاسٹر نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ بالآخر اس نے حملہ سے ایک دن پہلے مذکورہ ایکٹرس کو خط لکھا جس میں یہ فقرہ تھا Now you'll know who I am (H.T. 2-4-1981)

اب تم جان لوگی کہ میں کون ہوں۔ اس خط کے اگلے دن اس نے صدر امریکہ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اس کے بعد ایک گمنام نوجوان اچانک ساری دنیا کے اخباروں کی شاہ سرخی بنا ہوا تھا۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کی خبروں میں اس نے پہلا مقام حاصل کر لیا۔ صرف ایک بندوق کی لبلبی دبا کر اس نے وہ شہرت حاصل کر لی جو بے شمار لوگوں کو ساری عمر کام کرنے کے بعد بھی نہیں ملتی۔

ایک آدمی بظاہر مجرم ہو اور دوسرا بظاہر بے قصور مگر دونوں شہرت کے طالب ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے جینے کی سطح ایک ہے۔ دنیا کا قانون لوگوں سے ان کے ظاہر کے اعتبار سے معاملہ کرتا ہے، آخرت وہ مقام ہے جہاں لوگوں سے ان کے باطن کے اعتبار سے معاملہ کیا جائے گا۔ ایک شخص نام و نمود کے لئے دین کا علم بردار بنے، دوسرا شخص نام و نمود کے لئے لیڈری کرے تو دین دار کا انجام بھی وہی ہوگا جو خود پسند لیڈروں کا خدا کے یہاں ہونے والا ہے۔

کوئی چیز مشکل نہیں

ہیرا ہماری تمام معلوم دھاتوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ہیرے سے زیادہ سخت نہیں ہوتی۔ شیشہ کا فریم بنانے والے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ "قلم" کی صورت کی ایک چیز شیشہ کے تختہ پر گزارتا ہے اور شیشہ کٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس قلم میں ہیرے کا ٹکڑا لگا ہوتا ہے۔ ایسا اس لئے ممکن ہوتا ہے کہ ہیرا انتہائی سخت چیز ہے، خواہ وہ قدرتی ہو یا مصنوعی۔

تمام دوسری معدنیات کے برعکس ہیرے پر کسی قسم کا ایسڈ (تیزاب) اثر نہیں کرتا۔ آپ ہیرے کو خواہ کسی بھی تیزاب میں ڈالیں وہ ویسا کا ویسا باقی رہے گا۔ مگر اسی سخت ترین ہیرے کو اگر ہوا کی موجودگی میں خوب گرم کیا جائے تو وہ ایک بے رنگ گیس بن کر اڑ جائے گا۔ اور یہ گیس کاربن ڈائی آکسائڈ ہوگی۔

اسی طرح ہر چیز کا ایک "توڑ" ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی مشکل کا مقابلہ وہاں کریں جہاں وہ اپنی سخت ترین حیثیت رکھتی ہے تو ممکن ہے کہ آپ کی کوشش کامیاب نہ ہو۔ مگر کسی دوسرے مقام سے آپ کی یہی کوشش انتہائی حد تک نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

جب بھی آپ کا مقابلہ کسی مشکل سے پیش آئے تو سب سے پہلے یہ معلوم کیجئے کہ اس کا کمزور مقام کون سا ہے۔ اور جو اس کا کمزور مقام ہو وہیں سے اپنی جدوجہد شروع کر دیجئے۔ ایک چیز کسی اعتبار سے ناقابل شکست ہو سکتی ہے۔ مگر وہی چیز دوسرے اعتبار سے آپ کے لئے موم ثابت ہوگی۔

ایک شخص جس کو آپ کڑوے بول سے اپنا موافق نہ بنا سکے اس کو آپ میٹھے بول سے اپنا موافق بنا سکتے ہیں۔ اپنے جس حریف کو آپ لڑائی کے ذریعہ دبانے میں کامیاب نہ ہو سکے اس کو آپ اخلاق اور شرافت کے ذریعہ دبانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ایک ماحول جہاں آپ مطالبہ اور احتجاج کے ذریعہ اپنا مقام حاصل نہ کر سکے وہاں آپ محنت اور لیاقت کے ذریعہ اپنا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

ہیرا تیزاب کے لئے سخت ہے مگر وہ آنچ کے لئے نرم ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ ایک آدمی اگر ایک اعتبار سے سخت نظر آئے تو اس کو ہمیشہ کے لئے سخت نہ سمجھ لیجئے۔ اگر وہ ایک اعتبار سے سخت ہے تو دوسرے اعتبار سے نرم بھی ہو سکتا ہے۔

ہر چیز کا یہ حال ہے کہ وہ کسی اعتبار سے سخت ہے اور کسی اعتبار سے نرم۔ ایک شخص ایک انداز سے معاملہ کرنے میں بے لچک نظر آتا ہے مگر وہی دوسرے انداز سے معاملہ کرنے میں ہر شرط پر راضی ہو جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو جاننے میں زندگی کی تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

حقیقت پسندی

امریکہ نے اگست ۱۹۴۵ میں اپنے دو ایٹم بم جاپان پر گرائے۔ اس کے نتیجہ میں جاپان تہس نہس ہوکر رہ گیا۔ مگر جاپانیوں کو اس پر غصہ نہیں۔ کیونکہ امریکنوں کی کارروائی یک طرفہ نہیں تھی۔ بلکہ وہ جاپان کی متشددانہ کارروائی کے جواب میں کی گئی ——— جاپانیوں کا یہی حقیقت پسندانہ مزاج ہے جس نے انھیں موجودہ زمانہ میں غیر معمولی ترقی کے مقام تک پہنچایا ہے۔

امریکہ نے جاپان کے دو بڑے صنعتی شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے۔ چند منٹ کے اندر دونوں آباد شہر عظیم الشان کھنڈر بن گئے۔ ان میں سے ہر ایک شہر ۱۰ میل سے زیادہ بڑے رقبہ میں بسا ہوا تھا۔ مگر جب ان پر ایٹم بم گرا تو یہ حال ہوا کہ انسان، حیوان، درخت سب جل بھن کر رہ گئے۔ ڈیڑھ لاکھ آدمی مر گئے۔ دس ہزار آدمی ایسے تھے جو حادثہ کے بعد فوراً بخارات میں تبدیل ہو گئے۔ آج یہ دونوں شہر شاندار طور پر دوبارہ آباد ہو چکے ہیں۔ چوڑی سڑکیں، کشادہ مکانات، جگہ جگہ پارک اور باغ نے شہر کو بالکل نیا منظر عطا کیا ہے۔ اب شہر میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی عمارت باقی ہے جو دیکھنے والوں کو یاد دلاتی ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں اس شہر پر کیسی قیامت آئی تھی۔

ہندستان ٹائمس (نئی دہلی) کے ایڈیٹر مسٹر خوشونت سنگھ جاپان گئے تھے۔ اپنے سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ میں نے جاپان میں ایک بے حد عجیب بات دیکھی۔ جب کہ بقیہ دنیا نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے واقعات کو بہت بڑے پیمانہ پر امریکہ کے خلاف پروپگنڈے کے لئے استعمال کیا ہے، خود جاپانی ان واقعات کو امریکہ کے خلاف نہیں لیتے۔ خوشونت سنگھ نے اپنے جاپانی رفیق سے اس کی بابت سوال کیا تو خلاف توقع اس نے نرم لہجہ میں کہا:

We hit them first at Pearl Harbour. We killed a lot of them. They warned us of what they were going to do but we thought they were only bluffing. They beat us fair and square. We were quits. And now we are friends.

پہلے ہم نے ان کے پرل ہاربر پر حملہ کیا۔ ہم نے ان کے بہت سے لوگوں کو مار ڈالا۔ اس کے جواب میں وہ جو کچھ کرنے والے تھے اس سے انھوں نے ہمیں آگاہی دی۔ مگر ہم نے سمجھا کہ یہ محض دھونس ہے۔ انھوں نے ہمیں کسی دھوکے کے بغیر کھلے طور پر مارا۔ پہلے ہم ایک دوسرے سے دور تھے۔ اب ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں (ہندستان ٹائمس ۴ اپریل ۱۹۸۱)

ایٹمی حملہ سے مرنے والوں کی یادگار ہیروشیما میں قائم کی گئی ہے امن میوزیم (Peace Museum)

میں جنگی تباہ کاریوں کی تصویریں بھی لگی ہوئی ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھنے کے لئے ہر سال تقریباً ۷۰ لاکھ جاپانی ہیروشیما آتے ہیں۔ گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عام جاپانی کے دل میں امریکہ کے خلاف نفرت چھپی ہوئی موجود ہے۔ تاہم وہ اپنے عملی رویہ میں اس کا اظہار ہونے نہیں دیتے۔ انھوں نے اپنے مخالفانہ جذبات پر حقیقت پسندی کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ جاپانیوں کے اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ جنگ کے بعد بہت تھوڑی مدت میں انھوں نے دوبارہ غیر معمولی ترقی کر لی۔ ان کے یہاں نہ تیل نکلتا ہے اور نہ ان کے پاس معدنیات کی کانیں ہیں۔ ان کو بیش تر خام مال باہر سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود جاپان آج اپنے اعلیٰ سامانوں کی بدولت دنیا کی مارکٹ پر چھایا ہوا ہے۔

مسٹر خوشونت سنگھ نے جاپان میں وکیلوں کی بابت معلوم کیا۔ انھیں بتایا گیا کہ یہاں وکالت کے پیشہ کا حال اچھا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان جب کوئی نزاع پیدا ہوتی ہے تو وہ عدالت میں جانے کے بجائے باہمی گفتگو سے اس کو طے کر لیتے ہیں۔ جب آدمی اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار ہو تو جھگڑا کبھی آگے نہیں بڑھتا۔ جھگڑا ختم نہ ہونے کی وجہ اکثر حالات میں یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی یک طرفہ طور پر دوسرے کو الزام دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے دوسرے کے اندر بھی ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مسئلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جب ایک فریق اپنی جانب کی غلطی مان لے تو دوسرے کے اندر بھی جھکاؤ پیدا ہوگا اور مسئلہ وہیں کا وہیں ختم ہو جائے گا۔

اس حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کا جاپان کو یہ بہت بڑا فائدہ ملا ہے کہ ایک جاپانی دوسرے جاپانی پر اعتماد کرتا ہے۔ ہندستان جیسے ملکوں میں تجارتی معاہدے اور تجارتی خط و کتابت عام طور پر ایسے ماہرین انجام دیتے ہیں جو بہت بندھے ہوئے الفاظ اور قانونی پہلوؤں کی کامل رعایت کرنے والی زبان لکھنا جانتے ہیں مگر جاپانی اپنا وقت اس قسم کے تحریری مسودات تیار کرنے میں ضائع نہیں کرتے۔ امریکہ میں قانون دانوں کی تعداد ۵۰ ہزار ہے جب کہ جاپان میں قانون دانوں کی تعداد صرف ۱۱ ہزار ہے۔ جاپان میں ایسے لفظی ماہرین کا زیادہ کام ہی نہیں۔

جاپان کے اکثر تجارتی ادارے زبانی معاہدوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اولاً اس کا رواج جاپانیوں کے باہمی تعلقات میں ہوا مگر اب باہر کے تاجر بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ جاپانی کے منھ سے بولے ہوئے لفظ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ قانونی بندشوں سے اس آزادی کا یہ فائدہ ہے کہ کام تیزی سے ہوتا ہے اور غیر ضروری لفظی پابندیاں کارکردگی میں حارج نہیں بنتیں۔

جاپان کے اس مزاج نے اس کو باہمی اتحاد کا تحفہ دیا ہے۔ اور اتحاد بلاشبہ سب سے بڑی طاقت ہے۔ جاپان کی ترقی کا راز جاپانیات کے ایک ماہر نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

Never quarrelling amongst themselves, always making everything together

آپس میں کبھی نہ جھگڑنا، ہر کام ہمیشہ مل جل کر کرنا (ہندستان ٹائمس ۴ اپریل ۱۹۸۱ء)

عبادت کی روح

"نماز روزہ الگ چیز ہے اور معاملہ الگ چیز"۔ ایک صاحب نے کہا "نماز روزہ میں تو میں خدا کے حکم پر چلتا ہوں مگر جب کوئی دنیاداری کا معاملہ ہو تو اس کو تو دنیادارانہ طریقہ سے حل کرنا پڑتا ہے"۔ مذکورہ شخص نے یہ بات جس طرح صفائی کے ساتھ کہہ دی اس طرح ہر آدمی نہیں کہے گا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ آج ہر آدمی اسی اصول پر عمل کر رہا ہے۔ وہ نماز روزہ کو تو انھیں آداب و قواعد کے ساتھ دہرانے کی کوشش کرتا ہے جیسے خدا نے بتایا ہے۔ مگر لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے کے وقت اس طرح معاملہ کرتا ہے جس طرح اس کا جی چاہتا ہے کہ معاملہ کیا جائے۔ وہ نماز روزہ کے وقت اپنے کو پابند سمجھتا ہے اور اس کے بعد اپنے کو بالکل آزاد۔ حالاں کہ نماز روزہ اسی وقت نماز روزہ ہے جب کہ اس کی روح معاملات اور باہمی سلوک میں ظاہر ہو۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ نماز روزہ کو اپنے وقت پر ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر جب ان کا پڑوسی ان سے شکایت کرتا ہے کہ آپ کے فلاں عمل سے مجھ کو اور میرے گھر والوں کو تکلیف پہنچی ہے تو وہ صرف اس وقت اس کو قابل لحاظ سمجھیں گے جب کہ پڑوسی طاقت ور اور صاحب حیثیت ہو، اگر پڑوسی کم زور ہو تو وہ اس کی شکایت پر اتنی توجہ بھی نہ دیں گے کہ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

یہی حال تمام معاملات کا ہے۔ لوگ نماز روزہ کا تو اہتمام کریں گے مگر نماز روزہ کے تقاضے پورے نہ کریں گے۔ جب ان کی کسی سے شکایت ہو جائے تو وہ تواضع کے بجائے گھمنڈ کا مظاہرہ کریں گے۔ اگر کسی کے خلاف کچھ کرنا ہو تو وہ صبر کے بجائے بے صبری پر اتر آئیں گے۔ جب وہ کسی سے وعدہ کریں گے تو مشکل ہی سے ان کو یہ دھیان رہے گا کہ اس کو پورا کرنا ہے۔ جب وہ کسی سے بگڑ جائیں تو وہ بالکل بھول جائیں گے کہ کسی اوپر ظلم کرنا درحقیقت خود اپنے خلاف خدا کے سامنے کھلی ہوئی حجت قائم کر رہا ہے۔

نماز میں آدمی خدا کے سامنے جھکتا ہے۔ روزہ میں آدمی خدا کے حکم سے اپنی انتہائی ضروری چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کی زندگی اس دنیا میں خدا کے حکموں کی پابند ہوگی نہ کہ اس کے حکموں سے آزاد۔ اب جو شخص نماز روزہ تو کرے مگر زندگی کے معاملات میں جب خدا کا ایک حکم سامنے آئے تو وہ اس کو ٹھکرا دے اور اس کے بجائے نفس کے تقاضوں پر چلنے لگے تو گویا اس نے نماز پڑھ کر بھی نماز نہیں پڑھی۔ اس نے روزہ رکھ بھی روزہ نہیں رکھا۔ کیونکہ اس کا روزہ اور نماز محض ظاہری روزہ اور نماز تھا نہ کہ حقیقی روزہ اور نماز۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے

نپولین (۱۸۲۱ - ۱۷۶۹) جب پہلی قید کے بعد جزیرہ البا (Elba) سے بھاگا تو اس کے ساتھ اس کے وفادار سپاہیوں کی صرف ایک مختصر جماعت تھی۔ اس معزول تاجدار کے عزائم یہ تھے کہ وہ فرانس کے تخت پر دوبارہ قبضہ کرے۔ مگر پہلے ہی معرکہ میں اس کو فرانس کے ۲۰ ہزار جوانوں کا سامنا کرنا پڑا۔

نپولین دنیا کے انتہائی بہادر انسانوں میں سے ایک ہے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا کہ اپنی فوجی کمی کا لحاظ نہ کرتے ہوئے حریف سے ٹکرا جائے۔ جب دونوں فریق آمنے سامنے ہوئے تو وہ اکیلا بالکل غیر مسلح حالت میں اپنی جماعت سے نکلا اور نہایت اطمینان کے ساتھ فریق مخالف کی صفوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور اپنے سینہ کو ننگا کر دیا۔ اس کے بعد جذباتی انداز میں اپنے مخالف سپاہیوں سے، جن میں سے اکثر اس کے ماتحت رہ چکے تھے، خطاب کر کے بولا:

"تم میں سے کون وہ سپاہی ہے جو اپنے باپ کے ننگے سینہ پر فائر کرنے کو تیار ہو"

اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر طرف سے "کوئی نہیں، کوئی نہیں" کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ تمام سپاہی مخالف جماعت کو چھوڑ کر نپولین کے جھنڈے کے نیچے آ گئے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ نپولین اپنی بے سروسامانی کے باوجود فاتح ہوا۔ اس نے ملک فرانس کے تخت پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ حالاں کہ اس وقت وہ جس بے سروسامانی کی حالت میں تھا، اس کے ساتھ اگر وہ فرانس کی فوجوں سے لڑ جاتا تو میدان جنگ میں شاید اس کی لاش تڑپتی ہوئی نظر آتی۔

آدمی کے پاس کتنا ہی ساز و سامان ہو لیکن خطرہ پیش آنے کی صورت میں اگر وہ گھبرا اٹھے تو اس کے اعصاب جواب دے جائیں گے وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ صورت حال کے بارے میں سوچے اور مقابلہ کے لئے اپنا منصوبہ بنائے۔ اس کے برعکس اگر وہ خطرہ کے وقت اپنے ذہن کو حاضر رکھے تو بہت جلد ایسا ہو گا کہ وہ خطرہ کی اصل نوعیت کو سمجھ لے اور اپنے ممکن ذرائع کو بروقت استعمال کر کے کامیاب رہے۔

تاریخ میں بار بار کم تعداد اور کم طاقت والوں نے زیادہ تعداد اور زیادہ طاقت والوں پر کامیابی حاصل کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دشمن ہمیشہ اس سے بہت کم طاقت ور ہوتا ہے جتنا کہ وہ بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ اس دنیا کا نظام کچھ اس ڈھنگ پر بنا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ خواہ کتنا ہی طاقت ور ہو جائے اس کے اندر کوئی نہ کوئی کمزوری موجود رہتی ہے۔ اسی کمزوری کو استعمال کرنے کا نام دشمن پر فتح حاصل کرنا ہے۔ کسی شخص کی واحد طاقت اس کے فریق کی کمزوری ہے، اور یہ طاقت ہمیشہ ہر ایک کو حاصل رہتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس ہوشیاری کا ثبوت دے سکے کہ وہ اپنے حریف کی کمزوری کو استعمال کرنا جانتا ہے۔

اپنا حصہ ادا کرنا پڑتا ہے

ایک لطیفہ ہے کہ ایک شخص اس بات کو نہیں مانتا تھا کہ خدا رازق ہے اور وہی آدمی کو کھلاتا ہے۔ اس کے ساتھی اس کو سمجھاتے مگر وہ نہ مانتا۔ آخر اس نے کہا کہ میں اس کا تجربہ کروں گا۔ چنانچہ ایک روز وہ بالکل سویرے گھر سے نکلا اور جنگل میں جاکر ایک درخت کے اوپر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا: اگر کھلانے والا خدا ہے تو وہ ضرور یہاں بھی میرا رزق بھیجے گا۔

وہ سارا دن پیڑ پر بیٹھا رہا مگر خدا کی طرف سے اس کا کھانا نہ آیا۔ صبح ناشتہ کا وقت گزرا۔ پھر دوپہر کے کھانے کا وقت گزر گیا۔ اس کے بعد شام آئی اور شام کے کھانے کا وقت بھی گزر گیا اور اس کا کھانا نہ آیا۔ اب اس کو یقین ہو گیا کہ یہ بات غلط ہے کہ خدا کھلاتا ہے۔ اتنے میں اس کو کچھ آدمی آتے ہوئے نظر پڑے۔ وہ مسافر تھے اور انھیں کسی درخت کی تلاش تھی جس کے نیچے وہ رات گزار سکیں۔ انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اسی درخت کو پسند کیا جس کے اوپر مذکورہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔

درخت پر بیٹھے ہوئے آدمی نے بالکل خاموشی اختیار کر لی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ مسافروں نے پڑاؤ ڈالنے کے بعد لکڑیاں جمع کیں۔ پھر اپنی گٹھری کھولی اور چاول دال نکال کر کھچڑی پکانے لگے۔ جب کھچڑی تیار ہو گئی تو انھوں نے سوچا کہ اس کو بگھار بھی دے دیں۔ تیل میں مرچا ڈال کر جب انھوں نے گرم کیا تو اس کا دھواں اوپر اٹھا اور درخت پر بیٹھے ہوئے آدمی تک پہنچا۔ اس کی وجہ سے اس کو چھینک اور کھانسی آ گئی۔ کھانسی کی آواز سن کر مسافروں کو معلوم ہوا کہ درخت کے اوپر بھی کوئی آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ انھوں نے اس کو آواز دے کر بلایا اور اس کو درخت سے اتار کر اپنے کھانے میں شریک کر لیا۔

صبح کو آدمی خوش خوش اپنے گھر واپس آیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: تم نے جو بات کہی وہ صحیح تھی۔ مگر تم لوگوں نے مجھے آدھی بات بتائی۔ بے شک خدا کھلاتا ہے مگر وہ کھانسی آنے کے بعد کھلاتا ہے۔

اس لطیفہ میں تمثیل کے ذریعہ یہ بات بتائی گئی ہے کہ آدمی جو کچھ پاتا ہے وہ خدا کے دئے سے پاتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اسے اپنا بھی ایک حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ خدا اسی کو دیتا ہے جو خدا کے منصوبہ میں اپنے کو شریک کرے۔ انسان کی شرکت اگرچہ پورے واقعہ کا بے حد جزئی حصہ ہوتی ہے۔ مگر وہ بہر حال ضروری ہے۔ اس دنیا میں آدمی اس کا ثبوت دئے بغیر کچھ نہیں پا سکتا۔ یہی دینا تو پانے کا امتحان ہے۔ اسی شرط پر پانے کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ پھر اپنی طرف سے دینے کی شرط پوری کئے بغیر کوئی شخص خدا کے یہاں پانے والوں کی فہرست میں کس طرح شامل ہو سکتا ہے۔

بہادری یہ ہے

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد حضرت علی چوتھے خلیفہ مقرر ہوئے۔ اس وقت ملکی انتظام منتشر ہو رہا تھا۔ حضرت علی نے نظم ونسق کو از سر نو درست کرنے کے لئے حضرت عثمان کے زمانہ کے عمال بدل دئے۔ امیر معاویہ شام کے عامل (گورنر) چلے آرہے تھے۔ حضرت علی نے ان کی جگہ سہل بن حنیف کو حکومت شام کا فرمان دے کر روانہ کیا۔ وہ تبوک پہنچے تھے کہ امیر معاویہ کے سواروں نے روکا اور سہل کو مدینہ واپس ہونے پر مجبور کیا۔ حضرت علی نے امیر معاویہ کو لکھا کہ مہاجرین وانصار نے اتفاق عام کے ساتھ میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ اس لئے تم یا تو میری اطاعت کر دیا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس کے بعد مزید اسباب جمع ہوتے گئے، یہاں تک کہ جمل اور صفین کی لڑائیاں پیش آئیں جن میں تقریباً ۸۰ ہزار مسلمان خود مسلمانوں کی تلوار سے ہلاک ہو گئے۔

جنگ صفین (۳۷ھ) کے آخر زمانہ کا واقعہ ہے۔ حضرت علی فوج کے آگے تھے۔ وہ صفوں کو چیرتے ہوئے امیر معاویہ کے مقصورہ تک پہنچ گئے۔ انھوں نے پکار کر کہا "معاویہ، خلق خدا کا خون کیوں بہاتے ہو۔ آؤ ہم تم لڑ کر باہم فیصلہ کر لیں" امیر معاویہ کے ساتھی عمرو بن العاص نے کہا: بات تو انصاف کی ہے۔ امیر معاویہ نے کہا: کیا تم کو معلوم نہیں کہ جو اس شخص سے مقابلہ کرتا ہے وہ زندہ نہیں بچتا۔ عمرو بن العاص نے دوبارہ کہا: جو کچھ بھی ہو، تم کو مقابلہ کے لئے نکلنا چاہئے۔ امیر معاویہ نے کہا: تم چاہتے ہو کہ مجھ کو مروا کر میرے منصب پر قابض ہو جاؤ۔

امیر معاویہ جب سامنے نہیں آئے تو عمرو بن العاص خود حضرت علی سے مقابلہ کے لئے نکلے۔ دیر تک دونوں میں شمشیر زنی کا مقابلہ ہوتا رہا۔ آخر حضرت علی نے ایسا سخت وار کیا جس سے بچنا ممکن نہ تھا۔ عمرو بن العاص بدحواس ہو کر اپنے گھوڑے سے لڑکھڑائے اور زمین پر اس طرح گر پڑے کہ ان کا جسم ننگا ہو گیا۔ حضرت علی نے جب عمرو بن العاص کو برہنہ حالت میں زمین پر پڑا ہوا دیکھا تو اپنا منھ پھیر لیا اور ان کو چھوڑ کر اپنی فوج میں واپس آ گئے۔

عمرو بن العاص بے حد ہوشیار آدمی تھے۔ وہ امیر معاویہ کے دست راست تھے۔ حضرت علی اس وقت عمرو بن العاص کا خاتمہ کر کے امیر معاویہ کی مخالفانہ مہم کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ مگر حریف کو برہنہ حالت میں دیکھ کر انھیں شرم آگئی۔ اپنے سخت ترین مدمقابل پر پوری طرح قابو پانے کے باوجود وہ اس کو چھوڑ کر چلے آئے۔ ان کی بہادری نے گوارا نہ کیا کہ وہ عاجز حریف کو اپنی تلوار کا نشانہ بنائیں۔

انصاف کی جیت

حضرت عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱ - ۶۲ ھ) پانچویں خلیفہ راشد ہیں۔ آپ کے خادم ابوامیہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز آپ کی اہلیہ سے کہا کہ مسور کی دال کھاتے کھاتے میرا برا حال ہوگیا ہے۔ خاتون نے جواب دیا: تمھارے خلیفہ کا بھی روز کا کھانا یہی ہے۔ آپ سے پہلے خلیفہ کی حفاظت کے لئے ایک سو سپاہی مقرر تھے، جب آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے سب کو دوسرے سرکاری کاموں میں لگا دیا اور فرمایا: میری حفاظت کے لئے قضاو قدر ہی کافی ہے۔ یہ اس شخص کا حال تھا جس کی سلطنت کے حدود سندھ سے لے کر فرانس تک پھیلے ہوئے تھے۔

آپ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ سمرقند کے باشندوں کا ایک وفد آیا۔ اس نے ایک فوجی سردار قتیبہ بن مسلم باہلی کے بارے میں یہ شکایت کی کہ اسلامی قاعدہ کے مطابق انھوں نے ہم کو پیشگی تنبیہ نہیں کی اور ہمارے شہر میں اچانک اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ لہذا ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔ سمرقند کی فتح حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے ہوئی تھی۔ اور اب اس پر سات سال گزر چکے تھے۔ مگر آپ نے انصاف کے تقاضے کو پورا کرنا ضروری سمجھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عراق کے حاکم کو لکھا کہ سمرقند کے لوگوں کے مقدمہ کی سماعت کے لئے ایک خصوصی قاضی مقرر کریں۔ عراق کے حاکم نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جمیع بن حاضر الباہلی کو اس کا قاضی مقرر کیا۔ ان کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ دونوں فریق نے آزادانہ طور پر اپنے اپنے دلائل پیش کئے۔ آخر میں قاضی نے سمرقند والوں کی شکایت کو درست قرار دیتے ہوئے فیصلہ سنایا کہ ——— مسلمانوں کی فوج سمرقند کو چھوڑ کر باہر آجائے اور اہل سمرقند کو ان کا قلعہ اور تمام دوسری چیزیں واپس کر دی جائیں۔ اس کے بعد اسلامی قاعدہ کے مطابق مسلمانوں کا فوجی سردار ان کے سامنے ضروری شرطیں پیش کرے۔ اگر وہ تمام شرطوں کو ماننے سے انکار کر دیں تو پھر اس کے بعد ان سے جنگ کی جائے۔

اسلامی فوج اس وقت فاتحانہ حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے چین جیسے ملک کے بادشاہوں کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر جب قاضی نے اپنا فیصلہ سنایا تو اسلامی فوج کے سردار نے کسی بحث کے بغیر اس کو مان لیا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ پوری فوج سمرقند چھوڑ کر نکل آئے۔ تاہم اس پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی۔ سمرقند کے لوگوں نے جب دیکھا کہ مسلمان اس قدر با اصول اور انصاف پسند ہیں تو وہ حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے انھوں نے کبھی ایسے بے لاگ انصاف کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلم فوج کا آنا ان کے لئے رحمت کا آنا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مرضی اور خوشی سے مسلم حکومت کو قبول کر لیا۔ وہ کہہ اٹھے: خوش آمدید، ہم آپ کے مطیع و فرماں بردار ہیں (مرحبا سمعنا و اطعنا، فتوح البلدان للبلاذری)

کل کو جانئے

ضیاء الرحمٰن (۱۹۸۱-۱۹۳۶) سابق صدر بنگلہ دیش ڈھاکہ سے چاٹگام گئے۔ وہاں وہ ۳۰ مئی ۱۹۸۱ کو سرکاری ریسٹ ہاؤس میں آرام کر رہے تھے کہ رات کے وقت ان پر حملہ کر کے انھیں ہلاک کر دیا گیا۔ ان کو ہلاک کرنے والا بنگلہ دیش کا ایک فوجی افسر میجر جنرل منظور تھا۔ میجر جنرل منظور نے یہ گمان کیا تھا کہ صدر ضیاء الرحمٰن کو اقتدار سے ہٹانے کے بعد وہ بنگلہ دیش کی حکومت پر قبضہ کر لیں گے۔ مگر ان کا اندازہ غلط نکلا۔ فوج کے ایک دستہ کے سوا عام فوجیوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ صرف دو دن بعد ۲ جون ۱۹۸۱ کو مخالف فوجیوں نے انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

جنرل منظور کا جو انجام ہوا وہی اس دنیا میں ہر آدمی کا انجام ہو رہا ہے۔ کسی کا بظاہر فوج کی گولی کے ذریعہ ہوتا ہے اور کوئی فرشتوں کے ذریعہ موت کے انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ مگر کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ کوئی "جنرل منظور" یہ نہیں سوچتا کہ اپنے حریف کو قتل کرنے کے اگلے ہی دن وہ بھی قتل کر دیا جائے گا۔ دوسرے کو موت کے گڑھے میں گرانے کے بعد وہ خود بھی لازمی طور پر موت کے گڑھے میں دھکیل دیا جائے گا۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو کسی نہ کسی دائرہ میں اقتدار دیا جاتا ہے۔ کسی کے اختیار کا دائرہ بڑا ہے اور کسی کا دائرہ چھوٹا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہر آدمی اپنے دائرہ میں وہی بن جاتا ہے جو دوسرا اپنے دائرہ میں بنا ہوا ہے۔ یہاں ہر شخص "جنرل منظور" ہے۔ ہر شخص دوسرے کی کاٹ میں لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوسرے کی نفی پر اپنا اثبات کرنا چاہتا ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کا غلط اندازہ کر کے سمجھتا ہے کہ اگر اس نے دوسرے کو اس کے مقام سے ہٹا دیا تو اس کا خالی مقام اسے مل جائے گا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ جو چیز اس کا انتظار کر رہی ہے وہ کسی کا خالی مقام نہیں بلکہ خود اس کی اپنی قبر ہے۔

ہر شخص جو آج اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے وہ کل اپنے کو ناکام دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہر روز ہو رہا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص آج کے بعد آنے والے کل کو نہیں دیکھتا۔ ہر شخص اپنے "آج" کو جاننے کا ماہر ہے، کسی کو اپنے "کل" کی خبر نہیں۔

اپنے آج کو جاننے والو، اپنے کل کو جانو۔ کیونکہ بالآخر تم جس سے دوچار ہونے والے ہو وہ تمھارا کل ہے نہ کہ تمھارا آج۔

زندگی کا سفر

مصطفیٰ رشید شروانی، مشہور مجاہد آزادی اور صنعت کار اور ممبر راجیہ سبھا، ٹرین کے ذریعہ الہ آباد سے دہلی جارہے تھے۔ گورنر کشمیر مسٹر بی کے نہرو بھی انھیں کے کمپارٹمنٹ میں تھے۔ ٹرین غازی آباد پہنچی تھی کہ مصطفیٰ رشید شروانی پر دل کا سخت دورہ پڑا۔ قبل اس کے کہ انھیں کوئی طبی امداد پہنچے، فوراً ہی ٹرین میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ ۸ اپریل ۱۹۸۱ کا واقعہ ہے۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۵۹ سال تھی۔

اس طرح کے واقعات مختلف شکلوں میں ہر روز ہوتے ہیں۔ ہر دن بے شمار زندہ لوگ موت کے دروازہ میں داخل ہوجاتے ہیں۔ ہر روز لاکھوں آدمیوں کے ساتھ یہ واقعہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام سے نکل کر کسی "دہلی" کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ مگر درمیان ہی میں ان کو خدا کے فرشتے پکڑ لیتے ہیں اور ان کو "دہلی" کے بجائے آخرت کی منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔

ہر آدمی امیدوں اور تمناؤں کی ایک دنیا اپنے ذہن میں لئے ہوئے ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی امیدوں کی دنیا کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میں اپنے خوابوں والے "کل" کی طرف چلا جارہا ہوں۔ مگر بہت جلد اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمناؤں والی دنیا کے بجائے خدا کی دنیا کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ دنیا کی منزل کی طرف نہیں بلکہ آخرت کی منزل کی طرف چلا جارہا تھا۔ آدمی کہاں جارہا ہے اور کہاں پہنچ رہا ہے، مگر کسی کو اس کی خبر نہیں۔

آدمی اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کو دیکھ کر خوش ہو وہ خود اپنے اس مستقبل کی طرف ہانک دیا جاتا ہے جس کے لئے اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ آدمی اپنے آرام کے لئے ایک شاندار مکان کھڑا کرتا ہے مگر ابھی وہ وقت نہیں آتا کہ وہ اپنے خوابوں کے مکان میں سکھ چین کے ساتھ رہے کہ موت اس کے اور اس کے مکان کے درمیان حائل ہوجاتی ہے۔ آدمی اپنی معاش کو بڑھاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں عزت و ترقی کی بلندیوں پر اپنے کو بٹھانے جارہا ہوں مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا دن اس کے لئے جس چیز کا انتظار کر رہا تھا وہ ایک سنسان قبر تھی نہ کہ عزت و ترقی کی رونقیں۔

خدا ہر دن کسی "دہلی" کے مسافر کو "قبر" میں پہنچا رہا ہے۔ مگر آدمی ان واقعات سے سبق نہیں لیتا۔ اس کے باوجود ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ وہ "دہلی" کی طرف چلا جارہا ہے، قبر کی منزل اس کے لئے کبھی آنے والی نہیں۔

مشورہ پر اصرار نہیں

بدر کی لڑائی (۲ھ) سے کچھ پہلے قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ ساٹھ آدمیوں کی سرکردگی میں شام بھیجا گیا تھا۔ اس تجارتی قافلہ میں مکہ کے مردوں اور عورتوں نے اپنا تمام سرمایہ لگا دیا تھا۔ بدر کی لڑائی میں قریش کو مکمل شکست ہوئی۔ تاہم ابوسفیان کو اس میں کامیابی ہوئی کہ وہ تجارتی قافلہ کو ساحلی راستہ سے چلا کر مکہ پہنچ جائیں۔ جنگ کے بعد سارا مکہ جوش انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ قریش کے ذمہ دار افراد کا ایک اجتماع دار الندوہ میں ہوا۔ اس اجتماع میں متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ تجارتی قافلہ کے شرکا صرف اپنا اصل سرمایہ لے لیں اور منافع کی رقم پوری کی پوری محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کی تیاری میں لگا دی جائے۔ منافع کی یہ رقم پچاس ہزار دینار تھی جو اس وقت کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔ اب قریش نے زبردست تیاری کی اور شوال ۳ھ میں مکہ سے نکل کر مدینہ پر حملہ کے لئے روانہ ہوئے۔

اسی جنگ کا نام جنگ احد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی تو آپ نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ بڑے صحابہ میں سے اکثر کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ مگر نوجوان طبقہ اس کا پرجوش مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ہم یہاں ٹھہریں گے تو دشمن اس کو ہماری بزدلی اور کمزوری پر محمول کرے گا۔ اس لئے ہمیں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ عبداللہ بن ابی کی رائے بھی وہی تھی جو اکابر صحابہ کی تھی۔ (سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۷)

جن لوگوں کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، اس کی بڑی وجہ مدینہ کا جغرافیہ تھا جو ایک قدرتی حصار کا کام کرتا تھا۔ مدینہ کا جائے وقوع ایسا تھا کہ اس کے جنوب میں کھجوروں کے گھنے باغات اس کثرت سے تھے کہ ادھر سے کوئی فوج بستی کے اوپر حملہ نہیں کر سکتی تھی۔ اسی طرح مشرق اور مغرب کے بڑے حصہ میں پہاڑیاں تھیں جو کسی فوجی پیش قدمی کے لئے قدرتی روک کا کام کر رہی تھیں۔ اس لئے کوئی دشمن صرف ایک ہی سمت سے مدینہ پر حملہ کر سکتا تھا۔ اس جغرافی پوزیشن نے مدینہ کو جنگی اعتبار سے کافی محفوظ شہر بنا دیا تھا۔ گویا مدینہ ایک قسم کا قلعہ تھا۔ شہر سے باہر نکل کر وہ چاروں طرف سے دشمن کی زد میں ہو جاتے تھے جب کہ مدینہ کے اندر صرف ایک طرف سے مقابلہ کا انتظام کرنا تھا۔ غزوۂ احزاب میں مدینہ کے اسی جائے وقوع سے فائدہ اٹھایا گیا اور اس کی کھلی سمت میں (شمال مغربی رخ پر) خندق کھود کر پورے شہر کو محفوظ کر لیا گیا تھا۔

اکابر صحابہ کی اکثریت اور عبداللہ بن ابی کی رائے اگرچہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی۔ مگر

آپ نے نوجوان طبقہ کی رائے کا لحاظ کیا اور ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینہ سے نکل کر احد کی طرف روانہ ہوئے۔ عبداللہ بن ابی نے جب دیکھا کہ اس کی رائے نہیں مانی گئی جو بظاہر حالات معقول بھی تھی تو اس کو بہت دکھ ہوا۔ وہ مدینہ سے ساتھ نکل پڑا تھا مگر دل کے اندر غصہ باقی تھا۔ چنانچہ اسلامی لشکر ابھی مدینہ اور احد کے درمیان تھا کہ عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر مدینہ کی طرف واپس ہو گیا۔ عبداللہ بن ابی نے کہا:

اطاعهم وعصانی، ماندری علام نقتل انفسنا ھٰھنا ایھا الناس

رسول اللہؐ نے ان کی بات مان لی اور میری بات نہیں مانی۔ اے لوگو! ہم کو نہیں معلوم کہ ہم اپنی جانوں کو یہاں کیوں ہلاک کریں۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸)

احد کی جنگ میں شکست نے یہ ثابت کیا کہ انھیں لوگوں کی رائے درست تھی جو مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کے لئے کہتے تھے اور باہر نکلنے سے روکتے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد غزوۂ خندق (۵ ھ) میں اسی رائے کو اختیار کیا گیا اور مدینہ میں رہ کر مقابلہ کی تدبیر کی گئی۔ تاہم تمام بڑے صحابہ اپنے اختلاف رائے کو بھول کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور جنگ میں شدید نقصان اور تکلیف کے باوجود پوری بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ صرف عبداللہ بن ابی الگ ہوا اور اس کی بنا پر رئیس المنافقین کہلایا۔ عبداللہ بن ابی کی رائے اصولاً درست تھی۔ تجربہ نے بھی اس کے صحیح ہونے کی تصدیق کی۔ مگر صحت رائے کے باوجود اطاعت سے نکلنا اس کے لئے گمراہی اور خدا کی ناراضی کا سبب بن گیا۔

اسلام میں مشورہ کی بے حد اہمیت ہے۔ ہر آدمی کو حق ہے کہ وہ اپنا مشورہ پیش کرے۔ لیکن ہر مشورہ دینے والا اگر یہ بھی چاہے کہ اس کے مشورہ پر ضرور عمل کیا جائے تو کبھی کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مختلف رایوں میں سے کسی ایک ہی رائے کو عملاً اختیار کیا جا سکتا ہے نہ کہ ہر رائے کو۔ سچے مسلمان وہ ہیں جو مشورہ پیش کرنے کے بعد اپنا مشورہ بھول جائیں اور ذمہ داروں کی طرف سے جو فیصلہ ہو اس کو اس طرح مان لیں جیسے وہی ان کی اپنی رائے تھی۔

"سب سے بڑی قربانی رائے کی قربانی ہے" کسی شخص کا یہ قول بہت بامعنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے کی قربانی واحد چیز ہے جس کے اوپر کوئی مضبوط اجتماعیت کھڑی ہوتی ہے۔ کوئی عمارت صرف اس وقت بنتی ہے جب کہ کچھ اینٹیں اپنے آپ کو زمین میں دبانے کے لئے تیار ہوں۔ اسی طرح کوئی حقیقی اجتماعیت صرف اس وقت قائم ہوتی ہے جب کہ کچھ لوگ اس کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنی رایوں کو اپنے سینہ میں چھپا لیں گے اور اختلاف رائے کے باوجود اتحاد عمل کا ثبوت دیں گے۔ اس قربانی کے بغیر کسی انسانی اجتماعیت کا وجود میں آنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اینٹوں کے بنیاد میں دفن ہوئے بغیر عمارت کا وجود میں آنا۔

قوم فرعون کے سرداروں نے کہا، کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دے گا کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑیں۔ فرعون نے کہا کہ ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے۔ اور ہم ان پر پوری طرح قادر ہیں۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اور آخری کامیابی اللہ سے ڈرنے والوں ہی کے لئے ہے۔ موسیٰ کی قوم نے کہا، ہم تمہارے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور تمہارے آنے کے بعد بھی۔ موسیٰ نے کہا قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنا دے، پھر دیکھے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو ۱۲۹ - ۱۲۷

بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر کے سامنے جو مسئلہ پیش کیا وہ حکومت کا پیدا کیا ہوا تھا۔ مگر پیغمبر نے اس کا جو حل بتایا وہ یہ تھا کہ اللہ کی طرف رجوع کرو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی مسائل کے بارے میں دنیا دار لیڈروں کے سوچنے کے انداز اور پیغمبر کے سوچنے کے انداز میں کیا فرق ہے۔ دنیا دار لیڈر اس قسم کے مسئلہ کا حل حکومت کی سطح پر تلاش کرتا ہے، خواہ وہ حکومت سے مصالحت کی صورت میں ہو یا حکومت سے تصادم کی صورت میں۔ مگر پیغمبر نے جو حل بتایا وہ یہ تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہو اس کو برداشت کرتے ہوئے خدا سے مدد کے طالب بنو، حکومت کی طرف سے بے نیاز ہو کر خدا کی طرف رجوع کرو۔

پھر پیغمبر نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ عام قومی ذوق کے خلاف جو حل پیش کر رہا ہے وہ کیوں پیش کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسائل اگرچہ بظاہر اقتدار کی طرف سے پیش آ رہے ہیں اور بظاہر اقتدار ہی کے ذریعہ ان کا حل بھی نکلے گا۔ مگر خود اقتدار کیسے کسی کو ملتا ہے۔ وہ محض اپنی تدبیروں سے کسی کو نہیں مل جاتا بلکہ براہ راست خدا کی طرف سے کسی کو دیئے جانے کا فیصلہ ہوتا ہے اور کسی سے چھینے جانے کا۔ جب اقتدار کا تعلق خدا سے ہے تو مسئلہ کے حل کی جڑ بھی یقیناً خدا ہی کے پاس ہو سکتی ہے۔

پھر یہ کہ یہ اقتدار جس کو بھی دیا جائے وہ حقیقۃً اس کے حق میں آزمائش ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بے طاقتی بھی آزمائش ہے اور طاقتور ہونا بھی آزمائش۔ آج جس کے پاس اقتدار ہے، اس کے پاس بھی اسی لئے ہے کہ اس کو آزمایا جائے کہ وہ ظالم اور متکبر بنتا ہے یا انصاف اور تواضع کی روش اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد جب اقتدار کا فیصلہ تمہارے حق میں کیا جائے گا اس وقت بھی اس کا مقصد تم کو جانچنا ہی ہوگا۔ جس طرح ایک گروہ کی نااہلی کی بنا پر اس سے اقتدار چھین کر کسی دوسرے گروہ کو دیا جاتا ہے اسی طرح دوسرا گروہ اگر نااہل ثابت ہو تو اس سے بھی چھین کر دوبارہ کسی اور کو دے دیا جائے گا۔

خوش حالی اور اقتدار جس کو آدمی دنیا میں چاہتا ہے وہ حقیقت میں آخرت میں ملنے والی چیز ہے۔ کیونکہ دنیا میں یہ چیزیں بطور آزمائش ملتی ہیں اور آخرت میں وہ بطور انعام خدا کے صالح بندوں کو دی جائیں گی۔

اور ہم نے فرعون والوں کو قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا کیا تاکہ ان کو نصیحت ہو۔ لیکن جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے کہ یہ ہمارے لئے ہے اور اگر ان پر کوئی آفت آتی تو اس کو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست بتاتے۔ سنو، ان کی بدبختی تو اللہ کے پاس ہے مگر ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ اور انھوں نے موسیٰ سے کہا، ہم کو مسحور کرنے کے لئے تم خواہ کوئی بھی نشانی لاؤ ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں ۱۳۲ — ۱۳۰

کسی بات کو غلط کہنا ہو تو اس کا غلط ہونا لفظوں کی صورت میں بتایا جاتا ہے اور کسی بات کو صحیح کہنا ہو تو اس کو بھی لفظوں ہی کے ذریعہ صحیح کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی کو مجرم قرار دینا ہو تو اس کو لفظوں کے ذریعہ مجرم قرار دیا جاتا ہے اور اگر کسی کو برسرِ حق ظاہر کرنا ہو تو اس کا برسرِ حق ہونا بھی لفظوں میں بتایا جاتا ہے۔ مگر الفاظ کا استعمال کرنے والا انسان ہے اور موجودہ امتحان کی دنیا میں انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ الفاظ کو جس طرح چاہے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔

امتحان کی اس دنیا میں آدمی کو جو آزادی دی گئی ہے اس میں سب سے زیادہ نازک آزادی یہ ہے کہ وہ حق کو باطل کہنے کے لئے بھی الفاظ پالیتا ہے اور باطل کو حق کہنے کے لئے بھی۔ وہ ایک کھلے ہوئے پیغمبرانہ معجزے کو جادو کہہ کر نظر انداز کر سکتا ہے۔ خدا اس کو کوئی نعمت دے تو وہ اس کو ایسے الفاظ میں بیان کر سکتا ہے گویا کہ اس کو جو کچھ ملا ہے اپنی صلاحیتوں اور کوششوں کی بدولت ملا ہے۔ حق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے خدا اس کے اوپر کوئی تنبیہی سزا بھیجے تو وہ آزاد ہے کہ اس کو وہ انھیں خدا پرست بندوں کی نحوست کا نتیجہ قرار دیدے جن کے ساتھ برا رویہ اختیار کرنے ہی کی وجہ سے اس پر یہ تنبیہ آئی ہے۔ خدا کی طرف سے ہر بات اس لئے آتی ہے کہ آدمی اس سے نصیحت پکڑے۔ مگر الفاظ کے ذریعہ آدمی ہر نصیحت کو ایک اٹارخ دے دیتا ہے اور اس کے اندر جو سبق کا پہلو ہے اس کو پانے سے محروم رہ جاتا ہے۔

"تم خواہ کوئی بھی نشانی دکھاؤ ہم ایمان نہیں لائیں گے" فرعون کا یہ جملہ بتاتا ہے کہ حق اپنی مکمل صورت میں موجود ہونے کے باوجود صرف اسی کو ملتا ہے جو اس کو پانا چاہے۔ بالفاظ دیگر، جو شخص حق کے معاملہ میں سنجیدہ ہو، جس کے اندر فی الواقع یہ آمادگی ہو کہ حق خواہ جہاں اور جس صورت میں بھی ملے وہ اس کو لے لے گا، اُس پر حق کا حق ہونا کھلتا ہے۔ اِس کے برعکس جو شخص اس معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو۔ جس کا حال یہ ہو کہ جو کچھ اس کے پاس ہے بس اسی پر وہ مطمئن ہے، وہ حق کو حق کی صورت میں دیکھنے سے عاجز رہے گا اور اسی لئے وہ اس کو اختیار بھی نہ کر سکے گا۔ اپنے حال پر مگن رہنا آدمی کو اپنے سے باہر کی چیزوں کے لئے بے خبر بنا دیتا ہے۔ وہ جان کر بھی نہیں جانتا، وہ سن کر بھی نہیں سنتا۔

آدمی اگر غیر متاثر ذہن کے تحت سوچے تو وہ ضرور حقیقت کو پالے گا۔ مگر اکثر لوگ اپنی نفسیات کے زیر اثر رائے قائم کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ حقیقت کو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔

پھر ہم نے ان کے اوپر طوفان بھیجا اور ٹڈی اور جوئیں اور مینڈک اور خون۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ دکھائیں پھر بھی انھوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔ اور جب ان پر کوئی عذاب پڑتا تو کہتے اے موسیٰ، اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کرو جس کا اس نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ اگر تم ہم پر سے اس عذاب کو ہٹا دو تو ہم ضرور تم پر ایمان لائیں گے اور تمھارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے۔ پھر جب ہم ان سے دور کر دیتے آفت کو کچھ مدت کے لئے جہاں بہرحال انھیں پہنچنا تھا تو اسی وقت وہ عہد کو توڑ دیتے ۱۳۵ — ۱۳۳

حضرت موسیٰ نے مصر میں تقریباً ۴۰ سال تک پیغمبری کی۔ آپ کے مشن کے دو اجزا تھے۔ ایک، فرعون کو توحید کا پیغام دینا۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے جانا اور وہاں آزادانہ فضا میں ان کی دینی تربیت کرنا۔ بنی اسرائیل (حضرت یعقوب کی اولاد) اس وقت شدید طور پر قبطی بادشاہ (فرعون) کی گرفت میں تھے۔ قبطی قوم ان کو اپنے زراعتی اور تعمیری کاموں میں بطور مزدور استعمال کرتی تھی۔ اس لئے قبطی حکمراں نہیں چاہتے تھے کہ بنی اسرائیل مصر سے باہر چلے جائیں۔

حضرت موسیٰ نے ابتداءً جب فرعون سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ مصر سے باہر جانے دے تو فرعون اور اس کے درباریوں نے اس کو سیاسی معنی پہنا کر آنجناب پر یہ الزام لگایا کہ وہ قبطی قوم کو مصر سے نکال دینا چاہتے ہیں (۱۱۰) یہ بات سراسر بے معنی تھی۔ کیونکہ حضرت موسیٰ کا منصوبہ تو خود اپنے آپ کو مصر سے باہر لے جانے کا تھا، اور فرعون نے یہ الٹا الزام لگایا کہ وہ قبطیوں کو ان کے ملک سے باہر نکال دینا چاہتے ہیں۔ اس وقت فرعون اور اس کے ساتھی اقتدار کے گھمنڈ میں تھے اس لئے سیدھی بات بھی ان کو ٹیڑھی نظر آئی۔

مگر بعد کے مرحلہ میں خدا نے فرعون اور اس کی قوم پر ہر طرح کی بلائیں نازل کیں۔ ان پر کئی سال تک مسلسل قحط پڑے۔ شدید گرج چمک کے ساتھ اولوں کا طوفان آیا۔ ٹڈیوں کے دل کے دل آئے جو فصل اور باغ کو کھا گئے اور ہر قسم کی سبزی کا خاتمہ کر دیا۔ جوئیں اور مینڈک اس کثرت سے ہو گئے کہ کپڑوں اور بستروں میں جوئیں ہی جوئیں تھیں اور گھروں اور راستوں میں ہر طرف مینڈک ہی مینڈک کودنے لگے۔ دریاؤں اور نالیوں کا پانی خون ہو گیا۔ فرعون اور اس کی قوم جب ان عجیب و غریب مصیبتوں میں مبتلا ہوئے تو وہ کہہ اٹھے کہ خدا اگر ان مصیبتوں کو ہم سے ٹال دے تو ہم بنی اسرائیل کو موسیٰ کے ساتھ جانے دیں گے ——— حضرت موسیٰ کے جس مطالبہ میں پہلے قبطیوں کے اخراج کی سیاسی سازش دکھائی دی تھی وہ اب خود بنی اسرائیل کی ہجرت کے ہم معنی نظر آنے لگی۔

آدمی اپنے کو محفوظ حالت میں پا رہا ہو تو وہ طرح طرح کی باتیں بناتا ہے۔ مگر جب اس سے حفاظت چھین لی جائے اور اس کو عجز اور بے بسی کے مقام پر کھڑا کر دیا جائے تو اچانک وہ حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ اب وہ بات خود ہی اس کی سمجھ میں آجاتی ہے جو پہلے سمجھانے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر انکار کی طاقت رکھتے ہوئے اقرار کرنے کا نام اقرار ہے۔ الفاظ چھن جانے کے بعد کوئی اقرار اقرار نہیں۔

پھر ہم نے ان کو سزا دی اور ان کو سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروا ہو گئے۔ اور جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے ان کو ہم نے اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔ اور بنی اسرائیل پر تیرے رب کا نیک وعدہ پورا ہو گیا بہ سبب اس کے کہ انھوں نے صبر کیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا جو وہ بناتے تھے اور جو وہ چڑھاتے تھے ۱۳۷-۱۳۶

انبیاء کی مخاطب قوموں پر جو عذاب آتا ہے وہ تکذیب آیات کی بنا پر آتا ہے۔ یعنی نشانیوں کو جھٹلانا۔ اس کے مقابلہ میں انبیاء کے ساتھیوں پر جو خصوصی نصرت اترتی ہے اس کا استحقاق ان کو صبر کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اپنے جذبات کو تھام کر اللہ کے طریقہ پر ثابت قدم رہنا۔

نشانیوں سے مراد وہ دلائل ہیں جو حق کو حق ثابت کرنے والے ہوتے ہیں مگر آدمی اپنی متکبرانہ نفسیات کی وجہ سے ان کو ماننے پر قادر نہیں ہوتا۔ وہ دلیل کے معاملہ کو دلیل پیش کرنے والے کا معاملہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ دلیل مان لی تو فلاں شخص کے مقابلہ میں میرا مرتبہ گھٹ جائے گا۔ وہ دلیل پیش کرنے والے کے مقابلہ میں اپنے کو بالا رکھنے کی خاطر دلیل کی بالاتری کو تسلیم نہیں کرتا۔ مگر یہی انسان کی آزمائش کا اصل مقام ہے۔ موجودہ دنیا میں خدا نشانیوں یا دلائل کے پردہ میں ظاہر ہوتا ہے، آخرت میں وہ بے حجاب ہو کر ظاہر ہو جائے گا۔ مگر ایمان وہی معتبر ہے جب کہ آدمی پردہ داری کے ساتھ ظاہر ہونے والے حق کو پالے۔ بے حجابی کے ساتھ ظاہر ہونے والے حق کو ماننا صرف آدمی کے جرم کو ثابت کرے گا نہ کہ وہ اس کو انعام کا مستحق بنائے۔ ایسا اقرار صرف اس بات کا ثبوت ہوگا کہ آدمی نے اپنی بے پروائی کی وجہ سے حق کو نہ جانا۔ اگر وہ اس کے بارے میں سنجیدہ ہوتا تو یقیناً وہ اس کو جان لیتا۔

اس کے مقابلہ میں خدا کے وفادار بندے ہیں جن کی سب سے نمایاں خصوصیت صبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی زندگی سراسر صبر کی زندگی ہے۔ اپنے جیسے ایک انسان کی زبان سے حق کا اعلان سن کر اس کو مان لینا، عادتوں اور مصلحتوں پر قائم شدہ زندگی کو حق اور اصول کی بنیاد پر قائم کرنا، لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی ایذاؤں کو خدا کی خاطر نظر انداز کرنا، حق کے مخالفین کی ڈالی ہوئی مصیبتوں سے پست ہمت نہ ہونا، یہ سب ایمان کے لازمی مراحل ہیں اور آدمی صبر کے بغیر ان مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزر نہیں سکتا۔

فرعون کو اپنے اقتدار پر اور اپنے باغوں اور عمارتوں پر گھمنڈ تھا۔ حضرت موسیٰ کی ہجرت کے بعد فرعون اور اس کا لشکر سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ اولوں اور ٹڈیوں نے مصر کے سرسبز و شاداب باغات کو اجاڑ دیا اور زلزلوں نے ان کی شاندار عمارتیں ڈھا دیں۔ دوسری طرف حضرت موسیٰ کی چند نسلوں کے بعد حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے زمانہ میں بنی اسرائیل اطراف مصر (شام و فلسطین) پر قابض ہو گئے۔ نشانیوں کو جھٹلانے والے ہمیشہ خدا کے غضب کے مستحق ہوتے ہیں اور صبر کرنے والے ہمیشہ خدا کی نصرت کے۔

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا۔ پھر ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو پوجنے میں لگ رہے تھے اپنے بتوں کے۔ انھوں نے کہا اے موسیٰ، ہماری عبادت کے لئے بھی ایک بت بنا دے جیسے ان کے بت ہیں۔ موسیٰ نے کہا، تم بڑے جاہل لوگ ہو۔ یہ لوگ جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ برباد ہونے والا ہے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ باطل ہے۔ اس نے کہا، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمھارے لئے تلاش کروں حالاں کہ اس نے تم کو تمام اہل عالم پر فضیلت دی ہے۔ اور جب ہم نے فرعون والوں سے تم کو نجات دی جو تم کو سخت عذاب میں ڈالے ہوئے تھے۔ تمھارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمائش تھی ۱۳۸ - ۱۴۱

بنی اسرائیل بحر احمر کے شمالی سرے کو پار کر کے جزیرہ نمائے سینا میں پہنچے۔ پھر شمال سے جنوب کی طرف سمندر کے کنارے کنارے اپنا سفر شروع کیا۔ اس درمیان میں کسی مقام سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل نے ایک قوم کو دیکھا کہ وہ بت کی پرستش میں مشغول ہے۔ اس وقت بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں نے (نہ کہ سارے بنی اسرائیل نے) یہ تقاضا کیا کہ ان کے لئے ایک بت بنا دیا جائے۔

آدمی کی سب سے بڑی کمزوری ظاہر پرستی ہے۔ وہ غیب میں چھپے ہوئے خدا پر اپنا ذہن پوری طرح جما نہیں پاتا، اس لئے وہ کسی نہ کسی ظاہری چیز میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ کچھ بے شعور لوگ پتھر اور دھات کے بنے ہوئے بتوں کے آگے جھکتے ہیں۔ اور جو لوگ زیادہ مہذب ہیں وہ کسی شخصیت، کسی قوم یا کسی تمدنی ڈھانچہ کو اپنا مرکز توجہ بنا لیتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے کچھ افراد نے جب حضرت موسیٰ سے ظاہری بت گھڑنے کی فرمائش کی تو آپ نے فرمایا یہ لوگ جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ سب برباد کیا جانے والا ہے یعنی ہمارا مشن تو یہ ہے کہ ہم ان ظاہری خداؤں کو توڑ کر ختم کر دیں اور آدمی کو پوری طرح صرف ایک خدا کا پرستار بنائیں۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ ہم خود ہی اس قسم کا ایک ظاہری خدا اپنے لئے گھڑ لیں۔

"بنی اسرائیل کو تمام اہل عالم پر فضیلت دی"، سے مراد کسی قسم کی نسلی فضیلت نہیں ہے بلکہ منصبی فضیلت ہے۔ یہ اسی معنی میں ہے جس میں امت محمدی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "تم خیر امت ہو"۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ کسی گروہ کو اپنی کتاب کا حامل بناتا ہے اور اس کے ذریعہ دوسری اقوام تک اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ منصب بنی اسرائیل (یہود) کو حاصل تھا، ختم نبوت کے بعد یہ منصب امت محمدی کو دیا گیا ہے۔

فرعون کو یہ موقع ملنا کہ وہ بنی اسرائیل پر ظلم کرے، یہ بنی اسرائیل کے لئے بطور آزمائش تھا نہ کہ بطور عذاب۔ اس طرح کی آزمائش اس لئے ہوتی ہے کہ اہل ایمان کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا جائے۔ یہ معلوم کیا جائے کہ کون مشکل حالات میں خدا کے دین سے پھر جاتا ہے اور کون ہے جو صبر کی حد تک خدا کے دین پر قائم رہنے والا ہے۔

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس مزید راتوں سے تو اس کے رب کی مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی۔ اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا، میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا، اصلاح کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا۔ اور جب موسیٰ ہمارے وقت پر آگیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا، مجھے اپنے کو دکھا دے کہ میں تجھ کو دیکھوں۔ فرمایا، تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو تم بھی مجھ کو دیکھ سکو گے۔ پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب ہوش آیا تو بولا میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں　۱۴۳-۱۴۲

حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے بڑے بھائی تھے، حضرت موسیٰ کی عمر ان سے تین سال کم تھی۔ مگر نبوت اصلاً حضرت موسیٰ کو ملی اور حضرت ہارون ان کے ساتھ صرف مددگار کی حیثیت سے شریک کئے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینی عہدوں کی تقسیم میں اصل اہمیت استعداد کی ہے نہ کہ عمر یا اسی قسم کی دوسری اضافی چیزوں کی۔

حضرت موسیٰ کو مصر میں دعوتی احکام دیے گئے تھے اور صحرائے سینا میں پہنچنے کے بعد پہاڑی پر بلا کر قانونی احکام دیے گئے۔ اس سے خدائی احکام کی ترتیب معلوم ہوتی ہے۔ عام حالات میں خدا پرستوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ ذاتی زندگی کو درست کریں اور خدا کے پرستار بن کر رہیں۔ اسی کے ساتھ دوسروں کو بھی توحید و آخرت کی طرف بلائیں۔ مگر جب اہل ایمان آزاد اور بااختیار گروہ کی حیثیت حاصل کر لیں، جیسا کہ صحرائے سینا میں بنی اسرائیل تھے، تو ان پر یہ فرض بھی عائد ہو جاتا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کو شرعی قوانین کی بنیاد پر قائم کریں۔

حضرت موسیٰ نے اپنی غیر موجودگی کے لئے جب حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کا نگراں بنایا تو فرمایا: اَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ (۱۴۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی سربراہ کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا بنیادی اصول کیا ہے۔ وہ ہے ـــــ اصلاح اور مفسدین کی پیروی نہ کرنا۔ اصلاح سے مراد یہ ہے کہ مختلف افراد کے درمیان انصاف کا توازن کسی حال میں ٹوٹنے نہ دیا جائے۔ ہر ایک کو وہی ملے جو اس کو از روئے عدل ملنا چاہیے اور ہر ایک سے وہی چھینا جائے جو از روئے عدل اس سے چھینا جانا چاہیے۔ اس اصلاحی عمل میں اکثر اس وقت خرابی پیدا ہوتی ہے جب کہ سردار "مفسدین" کی پیروی کرنے لگے۔ یہ پیروی کبھی اس شکل میں ہوتی ہے کہ اس کے مقربین اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر جو کچھ کہیں وہ ان کو مان لے۔ اور کبھی اس طرح ہوتی ہے کہ مفسدین کی طاقت سے خوف زدہ ہو کر وہ خاموشی اختیار کرے۔

حضرت موسیٰ نے خدا کو دیکھنا چاہا اور جب معلوم ہوا کہ خدا کو دیکھنا ممکن نہیں تو انھوں نے توبہ کی اور بغیر دیکھے ایمان کا اقرار کیا ـــــ انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ دیکھے بغیر خدا کو مانے۔ خدا کو دیکھنا ایک اخروی انعام ہے پھر وہ موجودہ دنیا میں کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔

اللہ نے فرمایا، اے موسیٰ میں نے تم کو لوگوں پر اپنی پیغمبری اور اپنے کلام کے ذریعہ سے سرفراز کیا۔ پس اب لو جو کچھ میں نے تم کو عطا کیا ہے۔ اور شکر گزاروں میں سے بنو۔ اور ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔ پس اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں۔ عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا ۱۴۵-۱۴۴

حضرت موسیٰ کو پہلی بار نبوت پہاڑ کے اوپر ملی تھی اور دوسری بار بھی تورات کے احکام ان کو پہاڑ پر بلا کر دئے گئے۔ یہ اس بات کا ایک اشارہ ہے کہ خدا کا فیضان حاصل کرنے کی سب سے زیادہ موزوں جگہ فطرت کا ماحول ہے نہ کہ انسانی آبادیوں کا ماحول۔ انسانوں کی پرشور دنیا سے نکل کر آدمی جب پتھروں اور درختوں کی خاموش دنیا میں پہنچتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ مصنوعی احساسات سے خالی ہو کر اپنی فطری حالت پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ کسی آدمی کے لئے بہترین لمحہ ہوتا ہے جب کہ وہ بے آمیز فطری انداز میں سوچے اور یکسو ہو کر اپنے رب سے جڑ سکے۔

پیغمبر عام انسانوں میں سے ایک انسان ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی اعتبار سے کوئی غیر انسانی مخلوق نہیں ہوتا۔ اس کی خصوصیت صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی پیدائشی استعداد کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اس لئے خدا اس کو چنتا ہے کہ وہ اس کے پیغام کا حامل بنے اور لوگوں کے درمیان اس کی قابل اعتماد نمائندگی کرے۔ حضرت موسیٰ اس وقت اپنی قوم کے بہترین شخص تھے اس لئے خدا نے ان کو اپنا پیغمبر چنا اور ان پر اپنا کلام اتارا۔

خدا کے کلام میں اگرچہ ہدایت سے متعلق ہر قسم کی ضروری تفصیل موجود ہوتی ہے مگر وہ الفاظ میں ہوتی ہے اور موجودہ امتحانی دنیا میں بہرحال اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ آدمی ان الفاظ کی غلط تشریح کر کے اس کو غیر مطلوب معنی پہنا دے۔ مگر جو شخص ہدایت کے معاملہ میں سنجیدہ ہو اور خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو وہ ان الفاظ سے وہی معنی لے گا جو کلام الٰہی کے شایان شان ہے نہ کہ وہ جو اس کے نفس کو مرغوب ہے۔

"میں عنقریب تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا"، یعنی اپنے اس سفر میں آگے چل کر تم ان قوموں کے کھنڈرات سے گزرو گے جنھیں اس سے پہلے خدا کی ہدایت دی گئی تھی۔ مگر وہ اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے میں ناکام ثابت ہوئے۔ حالات کے دباؤ یا جذبات کے میلان کو نظر انداز کر کے وہ اس پر ٹھیک طرح قائم نہ رہ سکے۔ چنانچہ ان کا انجام یہ ہوا کہ وہ ہلاک کر دئے گئے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمھارا انجام بھی دنیا و آخرت میں وہی ہوگا جو ان پچھلی قوموں کا ہوا۔ خدا کا معاملہ جیسا ایک قوم کے ساتھ ہے ویسا ہی معاملہ دوسری قوم کے ساتھ ہے۔ عدل الٰہی کی میزان میں ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

اس دنیا میں یہ موقع ہے کہ آدمی اپنی خودساختہ تشریح سے خدا کے احسن کلام کا کوئی غیر احسن مفہوم نکال لے۔ مگر یہ ایسی جسارت ہے جو فرماں برداری کے دعوے دار کو بھی نافرمانوں کی فہرست میں شامل کر دیتی ہے۔

میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق گھمنڈ کرتے ہیں۔ اور اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں۔ اور اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو نہ اپنائیں گے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا لیں گے۔ یہ اس سبب سے ہے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان کی طرف سے اپنے کو غافل رکھا۔ اور جنھوں نے ہماری نشانیوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے اعمال اکارت ہو گئے اور وہ بدلے میں وہی پائیں گے جو وہ کرتے تھے ۱۴۷-۱۴۶

دنیا میں زندگی گزارنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی نے اپنے آنکھ اور کان کھلے رکھے ہوں۔ وہ چیزوں کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھتا اور سنتا ہو۔ ایسے آدمی کے سامنے حق آئے گا تو وہ اس کو پہچان لے گا۔ دنیا میں بکھری ہوئی خدائی نشانیاں اس کو جو سبق دیں گی وہ ان کو پالے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی متکبرانہ نفسیات کے ساتھ جی رہا ہو۔ وہ زمین میں اس طرح رہتا ہو جیسے وہ اس کا مالک ہے، اس کو اپنے ذاتی داعیات کے سوا کسی اور چیز کی پروا نہ ہو۔ وہ سمجھتا ہو کہ یہاں جو کچھ اسے مل رہا ہے وہ اپنی لیاقت کی وجہ سے مل رہا ہے۔ اپنی ملی ہوئی چیزوں میں اس کو کسی اور کی مرضی کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس دوسرے آدمی کا استغنار اس کے لئے قبول حق میں رکاوٹ بن جائے گا۔

پہلے آدمی کی نفسیات لینے والی نفسیات ہوتی ہے۔ وہ اپنے کھلے ذہن کی وجہ سے خدا کے ہر اشارہ کو پڑھ لیتا ہے۔ اور فوراً اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے آدمی کی نفسیات بے نیازی کی نفسیات ہوتی ہے۔ اس کے سامنے حق کے دلائل آتے ہیں مگر وہ ان کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے سامنے قدرت خاموش زبان میں اپنا نغمہ چھیڑتی ہے مگر وہ اس پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس کو اپنے سے باہر کسی سچائی کی طرف رغبت نہیں ہوتی ——— موت کے بعد آنے والی دنیا صرف پہلے لوگوں کے لئے ہے۔ دوسرے لوگ خدا کی ابدی دنیا میں اسی طرح نظر انداز کر دئے جائیں گے جس طرح موجودہ امتحان کی دنیا میں وہ خدا کی بات کو نظر انداز کئے ہوئے تھے۔

گمراہی کا راستہ نفس کے محرکات کے تحت بنتا ہے اور ہدایت کا راستہ وہ ہے جو نفس اور ماحول کے اثرات سے اوپر اٹھ کر خالص خدا کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اب جو لوگ اپنی ذات کی سطح پر جی رہے ہوں، جو صرف اپنے نفس کے اندر ابھرنے والے داعیات کو جانتے ہوں وہ گمراہی کے راستہ کو عین اپنی چیز سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ ہدایت کا راستہ ان کو اپنے مزاج کے اعتبار سے اجنبی دکھائی دے گا اس لئے وہ اس کی طرف بڑھنے میں بھی ناکام ثابت ہوں گے۔

بڑائی کی نفسیات اس چیز کو بآسانی قبول کر لیتی ہے جس میں اس کی بڑائی باقی رہے۔ اور جہاں اس کی بڑائی مشتبہ ہوتی ہو اس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنایا، ایک دھڑ جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ نہ ان سے بولتا ہے اور نہ کوئی راہ دکھاتا ہے۔ اس کو انھوں نے معبود بنالیا اور وہ بڑے ظالم تھے۔ اور جب وہ پچھتائے اور انھوں نے محسوس کیا کہ وہ گمراہی میں پڑ گئے تھے تو انھوں نے کہا، اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہم کو نہ بخشا تو یقیناً ہم برباد ہو جائیں گے۔ اور جب موسیٰ رنج اور غصہ میں بھرا ہوا اپنی قوم کی طرف لوٹا تو اس نے کہا، تم نے میرے بعد میری بہت بری جانشینی کی۔ کیا تم نے اپنے رب کے حکم سے پہلے ہی جلدی کر لی۔ اور اس نے تختیاں ڈال دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ ہارون نے کہا، اے میری ماں کے بیٹے، لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھ کو مار ڈالیں۔ پس تو دشمنوں کو میرے اوپر ہنسنے کا موقع نہ دے اور مجھ کو ظالموں کے ساتھ شامل نہ کر۔ موسیٰ نے کہا، اے میرے رب معاف کر دے مجھ کو اور میرے بھائی کو اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ۱۵۱ — ۱۴۸

بنی اسرائیل کے گروہ میں اس وقت سامری نام کا ایک بہت شاطر آدمی تھا۔ حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کو حضرت ہارون کی نگرانی میں چھوڑ کر پہاڑ پر چلے گئے تو اس نے لوگوں کو بہکایا۔ اس نے لوگوں سے زیورات لے کر ان کو بچھڑے کی صورت میں ڈھال دیا۔ بت گری کے قدیم مصری فن کے مطابق بچھڑے کی یہ مورت اس طرح بنائی گئی تھی کہ جب اس کے اندر سے ہوا گزرے تو اس کے منھ سے خوار (بیل کی ڈکار کی سی آواز) آئے۔ لوگ عام طور پر عجوبہ پسند ہوتے ہیں۔ چنانچہ اتنی سی بات پر بہت سے لوگ شبہ میں پڑ گئے اور اس کے بارے میں خدائی تصور قائم کر لیا۔ ایک شاطر آدمی نے کچھ عوامی باتیں کر کے بھیڑ کی بھیڑ اپنے گرد جمع کر لی۔ اس کا زور اتنا بڑھا کہ حضرت ہارون اور اغلباً ان کے چند ساتھیوں کے سوا کوئی کھلم کھلا احتجاج کرنے والا بھی نہ نکلا۔ ظاہر ہے کہ جس عوامی طوفان میں پیغمبر کے نائب کی آواز دب جائے وہاں کیسے کوئی بولنے کی جرأت کر سکتا ہے۔

عوام کا ذوق ہر زمانہ میں یہی رہا ہے اور آج بھی وہ پوری طرح موجود ہے۔ آج بھی ایک ہوشیار آدمی اپنی تقریروں اور تحریروں سے کسی نہ کسی "خوار" پر لوگوں کی بھیڑ جمع کر لیتا ہے۔ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ جس چیز کے گرد وہ جمع ہو رہے ہیں وہ محض ایک تماشا ہے نہ کہ فی الواقع کوئی حقیقت۔ کوئی سنجیدہ آدمی اگر اس تماشے کی حقیقت کو کھولتا ہے تو اس کا وہی انجام ہوتا ہے جو بنی اسرائیل کے درمیان حضرت ہارون کا ہوا۔

حضرت موسیٰ نے جب دیکھا کہ بنی اسرائیل مشرکانہ فعل میں مشغول ہیں تو ان کو گمان ہوا کہ حضرت ہارون نے اصلاح کے سلسلہ میں کوتاہی کی ہے۔ چنانچہ غصہ میں انھیں پکڑ لیا۔ مگر جیسے ہی انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنی اصلاحی کوشش میں کوئی کمی نہ کی تھی تو ان کے بیان کے بعد فوراً رک گئے اور اپنے لئے اور حضرت ہارون کے لئے خدا سے دعا کرنے لگے ——— ایک مومن کو دوسرے مومن کے بارے میں بڑی سے بڑی غلط فہمی ہو سکتی ہے مگر معاملہ کی وضاحت کے بعد وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کو غلط فہمی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔

بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ان کو ان کے رب کا غضب پہنچے گا اور ذلت دنیا کی زندگی میں۔ اور ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں جھوٹ باندھنے والوں کو۔ اور جن لوگوں نے برے کام کئے پھر اس کے بعد توبہ کی۔ اور ایمان لائے تو بے شک اس کے بعد تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے ۱۵۳ — ۱۵۲

بنی اسرائیل کے بچھڑا بنانے کو یہاں افتراء (جھوٹ باندھنا) کہا گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ باطل کام حق کے نام پر کیا تھا۔ انھوں نے اپنا یہ کام خدا کے دین کا انکار کر کے نہیں کیا تھا بلکہ خدا کے دین کو مانتے ہوئے کیا تھا۔ اپنی اس بے دینی کو وہ دینی الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ مشرکین کے عام عقیدہ کی طرح، وہ کہتے تھے کہ خدا ان کی گھڑی ہوئی مورت میں حلول کر آیا ہے۔ اس لئے اس کی عبادت خود خدا کی عبادت کے ہم معنی ہے۔ حتیٰ کہ اس فعل کے لیڈر سامری نے اس کے حق میں کشف و کرامت کی دلیل بھی تلاش کر لی۔ اس نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ جبریل آئے ہیں اور میں نے ان کے گھوڑے کے نقش قدم سے ایک مٹھی مٹی اٹھائی ہے اور ایک بچھڑا بنا کر اس کے اندر وہ مٹی ڈال دی تو مقدس مٹی کی برکت سے وہ بچھڑا بولنے لگا۔ گویا سامری اور اس کے ساتھی خدا کی طرف ایسی بات منسوب کر رہے تھے جو خدا نے خود نہیں بتائی تھی۔ اس قسم کی نسبت افتراء (خدا پر جھوٹ باندھنا) ہے خواہ وہ ایک صورت میں ہو یا دوسری صورت میں۔

کوئی حامل دین گروہ جب اس قسم کا افتراء کرتا ہے، وہ بے دینی کے فعل کو دین کا نام دے دیتا ہے، تو یہ چیز خدا کے غضب کو شدید طور پر بھڑکا دیتی ہے۔ اس کے متعلق یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اس کو آخرت سے پہلے دنیا کی زندگی ہی میں رسوا کن سزا دی جائے۔ بنی اسرائیل کے لئے یہ دنیوی سزا اس صورت میں آئی کہ حضرت موسیٰ کے حکم پر ہر قبیلہ کے مخلص ذمہ داروں نے اپنے اپنے قبیلہ کے ان افراد کو پکڑا جنھوں نے بچھڑا بنانے کے اس کام میں حصہ لیا تھا اور اس فتنہ میں براہ راست شریک رہے تھے۔ اس کے بعد ہر قبیلہ کے افراد نے خود اپنے ہاتھ سے اپنے قبیلہ کے مجرمین کو قتل کر دیا۔ اس دردناک انجام سے صرف وہ لوگ بچے جو اپنے اس فعل پر سخت شرمندہ ہوئے اور انھوں نے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے توبہ کی۔

بنی اسرائیل کے جرم پر خدا نے جس سزا کا فیصلہ کیا اس کا نفاذ خود ان کی اپنی تلواروں کے ذریعہ کیا گیا۔ تاہم اس قسم کے فیصلہ کا نفاذ کبھی اغیار کی تلواروں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ اور اغیار کی تلواروں سے اس کا نفاذ اس وقت ہوتا ہے جب کہ سزا کے ساتھ رسوائی کو بھی شامل کر دینے کا فیصلہ کیا گیا ہو۔

گناہ پر توبہ یہ ہے کہ گناہ ہو جانے کے بعد آدمی اپنے اس فعل پر شدید شرمندہ ہو۔ توبہ کی اصل حقیقت شرمندگی ہے۔ یہ شرمندگی اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی اپنے پورے وجود سے فیصلہ کرے کہ آئندہ وہ ایسا فعل نہ کرے گا۔ کوئی گنہ گار جب اس طرح شرمندگی کا اور آئندہ کے لئے پرہیز کے عزم کا ثبوت دے دیتا ہے تو گویا کہ وہ دوبارہ ایمان لاتا ہے، دین کے دائرہ سے نکل جانے کے بعد وہ دوبارہ خدا کے دین میں داخل ہوتا ہے۔

اور جب موسیٰ کا غصہ تھما تو اس نے تختیاں اٹھائیں اور جو ان میں لکھا ہوا تھا اس میں ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چنے ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت کے لئے۔ پھر جب ان کو زلزلہ نے پکڑا تو موسیٰ نے کہا اے رب، اگر تو چاہتا تو پہلے ہی تو ان کو ہلاک کر دیتا اور مجھ کو بھی۔ کیا تو ہم کو ایسے کام پر ہلاک کرے گا جو ہمارے اندر کے بیوقوفوں نے کیا۔ یہ سب تیری آزمائش ہے تو اس سے جس کو چاہے گمراہ کر دے اور جس کو چاہے ہدایت دے۔ تو ہی ہمارا تھامنے والا ہے۔ پس ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے۔ اور تو ہمارے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی۔ ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ اللہ نے کہا، میں اپنا عذاب اسی پر ڈالتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو۔ پس میں اس کو لکھ دوں گا ان کے لئے جو ڈر رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں ۱۵۶ — ۱۵۴

بنی اسرائیل کے بچھڑا بنانے سے یہ ظاہر ہوا تھا کہ ان کے اندر خدا پر وہ یقین نہیں ہے جو ہونا چاہئے۔ چنانچہ ان کو پہاڑ پر بلایا گیا۔ حضرت موسیٰ مقررہ وقت کے مطابق بنی اسرائیل کے ستر نمائندہ افراد کو لے کر دربار کوہ طور پر گئے۔ وہاں خدا نے گرج چمک اور زلزلہ کے ذریعہ ایسے حالات پیدا کئے جس سے بنی اسرائیل کے لوگوں کے اندر انابت و خشیت پیدا ہو۔ چنانچہ اس کے بعد وہ خدا کے سامنے روئے گڑگڑائے اور اجتماعی توبہ کی۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ تورات کے احکام پر سچائی کے ساتھ عمل کریں گے۔

اس موقع پر حضرت موسیٰ نے دعا کی "اے ہمارے رب، ہمارے لئے دنیا اور آخرت میں بھلائی لکھ دے" اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا "میں جس پر چاہتا ہوں اپنا عذاب ڈالتا ہوں، اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے" حضرت موسیٰ کی دعا بحیثیت مجموعی اپنی پوری امت کے لئے تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے جواب میں واضح کر دیا کہ نجات اور کامیابی کوئی گروہی چیز نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ ہر ہر فرد کے لئے اس کے ذاتی عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اگرچہ میں تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحیم ہوں۔ مگر جو شخص عمل صالح کا ثبوت نہ دے وہ میری پکڑ سے بچ نہیں سکتا، خواہ وہ کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔

خدا کی کتاب ہدایت و رحمت ہوتی ہے۔ وہ دنیا کی زندگی میں آدمی کے لئے بہترین رہنما ہے اور آخرت میں خدا کی رحمت کا یقینی ذریعہ۔ مگر خدا کی کتاب کا یہ فائدہ صرف اس کو ملتا ہے جو "ڈر" رکھتا ہو، جس کو اندیشہ لگا ہوا ہو کہ معلوم نہیں خدا میرے ساتھ کیا معاملہ کرے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سچے طالب حق ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے جب حق آتا ہے تو وہ کسی قسم کی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہوئے بغیر اس کو پا لیتے ہیں۔ اس کے بعد خدا ان کے خوف اور امید کا مرکز بن جاتا ہے۔ ان کا سب کچھ خدا کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ ان کا ڈر ان کے شعور کو بیدار کر دیتا ہے۔ ان کی نگاہ سے تمام مصنوعی پردے ہٹ جاتے ہیں۔ خدا کی طرف سے ظاہر ہونے والی نشانیوں کو پہچاننے میں وہ کبھی نہیں چوکتے۔ وہ اندیشہ کی نفسیات میں جیتے ہیں نہ کہ قناعت کی نفسیات میں۔

جو لوگ پیروی کریں گے اس رسول کی جو نبی امی ہے، جس کو وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور ان کو برائی سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھہراتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور قیدیں اتارتا ہے جو ان پر تھیں۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی عزت کی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں

۱۵۷

بنی اسرائیل دیکھتے چلے آرہے تھے کہ جتنے نبی آتے ہیں وہ سب ان کی اپنی قوم میں آتے ہیں۔ آخری رسول خدا کے منصوبہ کے مطابق بنی اسماعیل میں آنے والا تھا اس لئے خدا نے بنی اسرائیل کے انبیاء کے ذریعہ انھیں پہلے سے اس کی خبر کردی۔ ان کی کتابوں میں کثرت سے اس کی پیشین گوئیاں ابھی تک موجود ہیں۔ ایسا اس لئے ہوا تاکہ جب آخری رسول آئے تو وہ کسی بڑے فتنہ میں نہ پڑیں اور بہ آسانی اس کو پہچان کر اس کے ساتھی بن جائیں۔

پیغمبر اسلام پڑھے لکھے نہ تھے۔ آپ امی رسول تھے۔ امیت کے ساتھ پیغمبری، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آخری اور انتہائی صورت میں جمع ہوئی یہی ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ معرفت خداوندی کا اظہار ہمیشہ "امیت" کی سطح پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ کسی ایسے شخص کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے جو دنیوی معیار کے لحاظ سے اس قسم کے عظیم کام کا اہل نہ سمجھا جاتا ہو۔ تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا نے بقراط اور افلاطون کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہو۔

دین کی اصل روح اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں جب اندرونی روح سرد پڑتی ہے تو ظواہر کا زور بہت بڑھ جاتا ہے۔ اب غیر ضروری موشگافیاں کرکے نئے نئے مسائل بنائے جاتے ہیں۔ روحانیت کے نام پر مشقوں اور ریاضتوں کا ایک پورا ڈھانچہ کھڑا کرلیا جاتا ہے۔ عوامی توہمات مقدس ہوکر نئی شریعت کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ یہود کا یہی حال ہوچکا تھا۔ انھوں نے خدا کے دین کے نام پر توہمات اور جکڑ بندیوں کا ایک خود ساختہ ڈھانچہ بنالیا تھا اور اس کو خدا کا دین سمجھتے تھے۔ پیغمبر اسلام نے ان کے سامنے دین کو اس کی فطری صورت میں پیش کیا۔ غیر ضروری پابندیوں کو ختم کرکے سادہ اور سچے دین کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی۔

پیغمبر جب آتا ہے تو سب سے بڑی نیکی یہ ہوتی ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ مگر یہ ایمان عام معنوں میں محض ایک کلمہ پڑھنا نہیں ہے۔ یہ بے روح ڈھانچہ والے دین سے نکل کر زندہ شعور والے دین میں داخل ہونا ہے۔ سابقہ مذہبی ڈھانچہ سے آدمی کی وابستگی محض تاریخی روایات یا نسلی رواج کے زور پر ہوتی ہے۔ مگر نئے پیغمبر کے دین کو جب وہ قبول کرتا ہے تو وہ اس کو شعوری فیصلہ کے تحت قبول کرتا ہے، وہ رسم سے نکل کر حقیقت کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے۔ بظاہر یہ ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ سادہ بات ہر دور میں انسان کے لئے مشکل ترین بات ثابت ہوئی ہے۔

کہو اے لوگو، بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف جس کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں ۔ وہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے ۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے امی رسول نبی پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ ۔ اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق کے مطابق رہنمائی کرتا ہے اور اسی کے مطابق انصاف کرتا ہے ۱۵۹ — ۱۵۸

"کہو میں سب انسانوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں" کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے تمام پیغمبر قومی پیغمبر تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین اقوامی پیغمبر ہیں ۔ یہ بات بطور تقابل نہیں کہی گئی ہے بلکہ بطور واقعہ کہی گئی ہے ۔

اصل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی دو بعثتیں ہیں ۔ ایک براہ راست، دوسری بواسطہ امت ۔ آپ کی براہ راست بعثت عرب کے لئے تھی (انعام ۹۲) اور آپ کی بالواسطہ بعثت سارے عالم کے لئے ہے (حج ۷۸) حکماً یہی نوعیت خدا کے تمام پیغمبروں کی تھی ۔ مگر دوسرے پیغمبروں کا دین محفوظ حالت میں باقی نہ رہ سکا اس لئے یہ ممکن نہیں ہوا کہ وہ تمام عالم کے لئے نذیر و بشیر بنتے ۔ آج مسیحیت کی تبلیغ سارے عالم میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہی ہے ۔ اس کے باوجود حضرت مسیح کی نبوت صرف فلسطین تک محدود ہو کر رہ گئی ۔ کیونکہ حضرت مسیح کے بعد ان کی تعلیمات اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہیں ۔ آج مسیحیت کے نام سے جو دین لوگوں تک پہنچ رہا ہے وہ حقیقۃً سینٹ پال کا دین ہے نہ کہ مسیح کا دین ۔ گویا نبیوں کے وسعت کار میں جو فرق ہے وہ فرق باعتبار واقعہ ہے نہ کہ باعتبار تفویض ۔

پیغمبر عربی کے متعلق بائبل میں یہ پیشین گوئی ہے کہ زمین کے سب قبیلے اس کے وسیلے سے برکت پائیں گے (پیدائش ۱۲/۳) سب قوموں تک آپ کی برکت پہنچنا اس لئے ممکن ہو سکا کہ آپ کا لایا ہوا دین محفوظ ہے ۔ حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کا دین محفوظ نہیں ۔ اس لئے بظاہر اس کی آواز سب تک پہنچ کر بھی اس کی برکت سب تک نہ پہنچ سکی ۔

عرب میں یہودی قبائل آباد تھے ۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو یہ فخر تھا کہ ان کے پاس خدا کی مقدس کتاب ہے ۔ ایسے لوگ ہمیشہ اپنے سے باہر کسی سچائی کو ماننے کے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں ۔ ان کا یہ احساس کہ وہ سب سے بڑی سچائی کو لئے ہوئے ہیں ان کے لئے کسی دوسرے کی طرف سے آنے والی سچائی کو قبول کرنے میں مانع ہو جاتا ہے ۔ یہی حال یہود کا ہوا ۔ ان کی بہت بڑی اکثریت ضد اور تعصب کی نفسیات میں مبتلا ہو گئی ۔ صرف چند لوگ (عبداللہ بن سلام وغیرہ) ایسے نکلے جنھوں نے کھلے ذہن کے ساتھ اسلام کو دیکھا ۔ انھوں نے اپنی دنیوی عزت کی پروا کئے بغیر اس کی صداقت کا اعلان کیا اور اپنی دنیوی زندگی کو اس کے حوالے کر دیا ۔

"رسول ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اس کے کلمات (ارشادات) پر" یہ جملہ بتاتا ہے کہ فلسفیوں کے خدا اور پیغمبر کے خدا میں کیا فرق ہے ۔ فلسفی کا خدا ایک مجرد روح ہے ۔ اس کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے کائنات میں قوت کشش کو ماننا ۔ قوت کشش نہ بولتی اور نہ حکم دیتی ۔ مگر پیغمبر کا خدا ایک زندہ اور باشعور خدا ہے ۔ وہ انسانوں سے ہم کلام ہوتا ہے ۔ وہ اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے اور اس حکم کے ماننے یا نہ ماننے پر ہر ایک کے لئے انعام یا سزا کا فیصلہ کرتا ہے ۔

جب بگاڑ آتا ہے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جنت کا ملنا نہ مسلمانوں کی تمناؤں پر ہے اور نہ یہود کی تمناؤں پر، جو شخص بھی کوئی برائی کرے گا اس کو اس کا بدلہ ضرور دیا جائے گا (لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوءً یجز بہ، نساء ۱۲۳) یعنی خدا نے جو دنیا بنائی ہے وہ عدل کے اصول پر بنائی ہے۔ یہ عدل کا اصول ہے ——— عمل اور انجام میں مطابقت۔ یہاں کسی کے ساتھ نہ ظلم ہے اور نہ جانب داری۔ یہاں ہر ایک کو ٹھیک وہی ملنے والا ہے جو اس نے کیا ہے۔ نہ کئے پر کسی کے لئے سزا نہیں اور کئے پر کوئی چھوڑا جانے والا نہیں۔ ایسی ایک دنیا میں اگر کوئی گروہ یہ سمجھ لے کہ اس کے ساتھ خصوصی معاملہ کیا جائے گا، اس کو اس ترازو پر نہیں تولا جائے گا جس ترازو پر دوسرے لوگ تولے جانے والے ہیں تو یہ صرف اس کی جھوٹی تمنائیں ہیں اور محکم قوانین پر مبنی اس خدائی دنیا میں کسی کی جھوٹی تمناؤں کے لئے یقینی طور پر کوئی جگہ نہیں۔

کسی گروہ کو آسمانی کتاب کا حامل بنانا اس کو دیگر قوموں کے مقابلہ میں خصوصی مقام دینا ہے۔ اس معنی میں پہلے یہود کو افضل الامم (بقرہ ۴۷) کہا گیا تھا۔ اور اسی معنی میں امت محمدی کو خیر الامم (آل عمران ۱۱۰) کہا گیا ہے۔ جو گروہ اس مقام افضلیت پر کھڑا کیا جائے اس پر دنیا میں خدا کے خصوصی انعامات ہوتے ہیں اور آخرت میں اس کے لئے جنت کی بشارتیں دی جاتی ہیں۔ مگر یہ انعامات کسی نسل یا قوم سے تعلق کی بنیاد پر نہیں ہوتے بلکہ تمام تر کارکردگی کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ بعد کے دور میں اس گروہ کے افراد اس فرق کو بھول جاتے ہیں۔ یہیں سے امانی (جھوٹی تمناؤں) کا آغاز ہو جاتا ہے۔ لوگ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ وہ خواہ عمل کریں یا نہ کریں خدا کے وعدے ان کے حق میں ضرور پورے کئے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی کتاب کی حامل کسی قوم کی صحت کیا ہے اور اس کا مرض کیا۔ اس کو اگر آج کل کی زبان میں بیان کرنا ہو تو یہ کہنا درست ہوگا کہ ایسی قوم جب صحیح ایمانی حالت پر ہو تو اس کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج ہوتا ہے اور حالت مرض میں ہو تو خوش خیالی کا۔

آخرت کی سرفرازیاں جن لوگوں کو جھوٹی تمناؤں اور خوش خیالیوں کی بنیاد پر مل رہی ہوں وہ عین اپنی نفسیات کی بنا پر دنیا کے معاملات میں بھی خوش خیال ہو جاتے ہیں۔ ان کی سیاست خوش خیالی کی راہ پر چل پڑتی ہے۔ وہ اپنی فرضی کارروائیوں سے حیرت انگیز طور پر بڑے بڑے نتائج کی امید کرنے لگتے ہیں۔ وہ حقیقتوں کی اس دنیا میں ایک خوش خیال گروہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

تقویٰ ہر چیز کا بدل

قال علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ : من اراد غنی بلا مال و ھیبۃ بلا سلطان وعزا بلا عشیرۃ فلیتق اللہ فان اللہ یابی ان یذل الا من عصاہ

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص چاہتا ہو کہ اس کو مال کے بغیر دولت مندی اور اقتدار کے بغیر رعب اور قبیلہ کے بغیر قوت ملے تو وہ اللہ سے ڈرے۔ کیونکہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نافرمانوں کے سوا کسی کو ذلیل نہیں کرتا۔

طبیعیاتی دنیا کے لئے اللہ کا ایک اٹل قانون ہے جس کو قانونِ فطرت کہا جاتا ہے۔ جو شخص بھی اس قانون فطرت کی پابندی کرے گا وہ طبیعیات کی دنیا میں کامیاب رہے گا۔ اسی طرح انسانی دنیا میں کامیابی کے لئے بھی اللہ کا ایک قانون ہے۔ اس قانون کا نام تقویٰ ہے۔ تقویٰ انسانی زندگی کی واحد یقینی شاہراہ ہے۔ جو شخص تقویٰ کی زندگی اختیار کرے وہ آخرت کی دنیا میں جنت کا مستحق بنتا ہے۔ نیز موجودہ دنیا میں بھی اللہ اس کو اپنی نصرت سے کامیاب کر دیتا ہے۔

تقویٰ کیا ہے، اللہ سے ڈر کر زندگی گزارنا۔ جو شخص اللہ سے ڈرے وہ حد درجہ قابل اعتماد انسان بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جو کہتا ہے وہی کرتا ہے۔ وہ جو وعدہ کرتا ہے اس کو پورا کرتا ہے۔ کسی کا کوئی حق ہو تو وہ حد درجہ ذمہ داری کے ساتھ اس کو ادا کرتا ہے۔ جو شخص ماحول میں اس قسم کا اعتماد حاصل کرلے اس کو دوسروں کا ساز و سامان ملنے لگتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ دوسروں کے مال پر تجارت کرے۔ دوسروں کے سودے پر اپنی دکان سجائے۔ دوسروں کے وسائل پر اپنی تعمیر کرے۔ اعتماد سب سے بڑا سرمایہ ہے اور تقویٰ اس اعتماد کو کسی انسان میں کامل درجہ میں پیدا کرتا ہے۔

رعب کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ آدمی کے اندر سے لالچ نکل جائے۔ تقویٰ کسی آدمی کے اندر سے حرص و لالچ کو بالکل نکال دیتا ہے۔ جو آدمی کسی سے ڈرتا نہ ہو۔ کسی سے کوئی غرض نہ رکھتا ہو۔ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس کی رغبت سے اس کا دل خالی ہو گیا ہو تو اس کے بعد فطری طور پر اس میں خود اعتمادی آجاتی ہے اور خود اعتمادی ایک ایسی تسخیری قوت ہے کہ جس کے اندر وہ پیدا ہو جائے اس سے لوگ مرعوب ہو کر رہ جاتے ہیں۔

حق پرست آدمی کا ایک نمائندہ خود اس کے حریف کے اندر موجود ہوتا ہے اور یہ انسانی فطرت ہے جس کا یہ حال ہو جائے کہ وہ تمام تر مظلوم ہو اور دوسرا تمام تر ظالم، وہ تمام تر انصاف پر ہو اور دوسرا تمام تر بے انصافی پر، وہ لوگوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرنے والا ہو اور لوگ اس کے معاملہ میں اللہ سے نڈر ہو جائیں تو ایسے شخص کی طرف لوگوں کے دل خود بخود کھنچ اٹھتے ہیں، وہ اکیلا ہوتے ہوئے بھی اپنے لئے بہت سے مددگار پالیتا ہے۔

دورِ جدید کا شرک

مولانا مناظر احسن گیلانی (۱۹۵۶ - ۱۸۹۲) نے لکھا ہے: پہلوں کی عقلوں کو سورج کی شعاعوں اور آگ کے شعلوں نے اگر چندھیایا تھا تو کیا پچھلوں کے سینوں میں برق کی قوتوں، ایٹم کی طاقتوں، پٹرول کی توانائیوں نے چکا چوند نہیں لگائی ہے۔ بزرگوں کے کارنامے، سورماؤں کی اولوالعزمیوں نے اگر پہلوں کو ان بزرگوں کی پتھر میں کھدی ہوئی مورتیوں کے آگے جھکایا تھا تو کیا پچھلوں کے لیڈروں نے اور قائدوں کے کارناموں نے ان کے اسٹیچو اور فوٹو کے ساتھ ساری قومی عزت و فلاح کو وابستہ نہیں کیا ہے (النبی الخاتم صفحہ ۱۵۶)

جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ نہیں مانتے۔ مگر جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ بھی اکثر مشرکانہ انداز میں اس کو مانتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جس طرح دوسرے معاملات میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اسی طرح شرک کی صورتیں بھی بدل گئی ہیں۔ قدیم شرک کی بنیاد اگر توہمات پر تھی تو جدید شرک کی بنیاد علم اور تہذیب پر ہے۔ بہت سے لوگ صورتوں کی تبدیلی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شرک میں مبتلا نہیں ہیں۔ لیکن اگر گہرائی کے ساتھ جائزہ لیجئے تو وہ بھی معروف مشرکوں سے کم مشرک نظر نہیں آئیں گے۔

خدا کو ماننے کی دو سطحیں ہیں۔ ایک فطری سطح اور دوسرے شعوری سطح۔ خدا انسان کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔ وہ فطرت انسانی میں ہر دوسری چیز سے زیادہ پیوست ہے۔ اس لئے آدمی ہر حال میں خدا کو ماننے پر مجبور ہے۔ حتیٰ کہ غافل اور ملحد انسان بھی نازک لمحات میں خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ مگر یہ سب فطری سطح پر خدا کا اقرار ہے۔ اور فطری سطح پر خدا کا اقرار معتبر نہیں۔ خدا کا اقرار صرف وہ معتبر ہے جو شعور کی سطح پر پیدا ہوا ہو۔

مشرک انسان کا معاملہ یہی ہے۔ وہ فطرت کی سطح پر خدا کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ مگر وہ شعور کی سطح پر خدا کا یقین نہیں کر پاتا۔ اس لئے خدا کے رسمی اقرار کے ساتھ وہ کچھ اور ہستیاں بنا لیتا ہے جن سے وہ اپنی امیدوں اور تمناؤں کو وابستہ کر سکے۔ خدا کو اگرچہ وہ مانتا ہے۔ مگر خدا صرف اس کے رسمی عقیدہ کا جزء ہوتا ہے، وہ اس کے شعور کا جزء نہیں ہوتا۔ وہ بظاہر خدا کو مانتا ہے مگر وہ اس کے شعور اور احساس میں ایک زندہ حقیقت کے طور پر شامل نہیں ہوتا۔ وہ اس کے فکر و عمل میں روح بن کر نہیں دوڑتا۔ اس کے شعور کو زندہ یقین اس کے مفروضہ خداؤں سے ملتا ہے۔ اس کے احساس کو تر و تازہ تڑپ ان ہستیوں سے ملتی ہے جن کو اس نے محسوس طور پر اپنے سامنے بٹھا رکھا ہے۔ خدا اس کے روایتی عقیدہ کا جزء ہوتا ہے اور شرکاء

اس کے جیتے جاگتے ذہن کا جزء ہوتے ہیں۔

شرک کسی صورت کا نام نہیں بلکہ حقیقت کا نام ہے۔ اور انسان اتنا ظاہر پسند ہے کہ وہ ہر زمانہ میں اپنے لئے کوئی نہ کوئی محسوس خدا گھڑ لیتا ہے۔ وہ خدا کو مانتے ہوئے بھی عملاً دوسروں کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا انسان بھی اتنا ہی مشرک ہے جتنا قدیم زمانہ کا انسان تھا۔ اگرچہ آج کے دیوتاؤں کے نام کچھ اور ہیں اور پہلے کے کچھ اور۔

توحید یہ ہے کہ آدمی اپنی عقیدت اور اپنے اعتماد کے جذبات کو صرف ایک خدا کے ساتھ وابستہ کردے۔ اور شرک یہ ہے کہ وہ زبان سے تو خدا کو خدا کہے۔ مگر اس کی حقیقی توجہ اور دلچسپیاں خدا کے سوا دوسروں کے ساتھ لگی ہوئی ہوں۔

موجودہ زمانہ میں بت کی پرستش بہت سے لوگوں نے چھوڑ دی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شرک ختم ہوگیا ہے۔ شرک اب بھی پوری شان کے ساتھ لوگوں کے یہاں موجود ہے۔ فرق یہ ہے کہ آج پتھر کے بت کے بجائے دوسری چیزیں پوجی جاتی ہیں۔ بے شمار لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اعلیٰ ترین جذبات کا مرکز اپنے قائدوں اور رہنماؤں کو بنا رکھا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے اداروں اور اپنی جماعتوں کے ساتھ وہی قلبی وابستگی رکھتے ہیں جو خدا کے ساتھ ہونی چاہیے۔ بہت سے لوگ اپنے ملک اور اپنی قوم کو خدا کا درجہ دئے ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے لئے معیار زندگی اور مادی ترقیاں وہی برتر مقام حاصل کئے ہوئے ہیں جو خدا کا مقام ہونا چاہیے۔

موجودہ زمانہ میں بت پرستی کا شرک زیادہ تر عوام میں باقی رہ گیا ہے۔ مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کا شرک شخصیت پرستی اور مادہ پرستی ہے۔ لوگ خدا کو مانتے ہوئے اپنی محبوب شخصیتوں کے پرستار بنے ہوئے ہیں۔ وہ زبان سے خدا کا اقرار کرتے ہیں مگر عملاً ان کی ساری گرویدگی صرف مادی مصلحتوں اور دنیوی مفادات سے ہے۔

توحید کا پرستار وہ ہے جس کے جذبات خدا سے اتنا زیادہ وابستہ ہوجائیں کہ اس کی تنہائیاں خدا کی یاد میں بسر ہوتی ہوں۔ اس کو خدا کے تذکرہ سے لذت ملتی ہو۔ وہ اپنی صبح و شام کی زندگی میں خدا کو سب سے اونچا مقام دئے ہوئے ہو۔ اس کی نظر میں خدا کے سوا ہر دوسری چیز ہیچ بن گئی ہو۔ وہ سب کچھ خدا کے حوالے کرکے اپنے آپ کو اس کے لئے خالی کرے۔

موحد صرف اللہ والا ہوتا ہے اور مشرک اللہ کے ساتھ دوسروں والا بھی۔

جھگڑے سے بچ کر

دو کسانوں کے کھیت ملے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک مینڈ کا جھگڑا ہوگیا۔ ہر ایک کہتا تھا کہ مینڈ میری ہے۔ دونوں کھیت کی مینڈ پر لڑ گئے۔ یہ جھگڑا پہلے "مینڈ" کا تھا پھر وہ "ساکھ" کا مسئلہ بن گیا۔ ہر ایک کو دکھائی دینے لگا کہ مینڈ سے ہٹنا لوگوں کی نظر میں اپنے آپ کو بے عزت کرنا ہے۔ چنانچہ جھگڑا بڑھتا رہا۔ وہ یہاں تک بڑھا کہ دونوں طرف قتل ہوئے، کھیت کاٹے گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی چیزیں جلائیں۔ اس کے بعد معاملہ اور بڑھا۔ وہ پولس اور عدالت کا معاملہ بن گیا۔ مقدمہ بازی کا لمبا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ مقدمات ۲۰ سال بعد صرف اس وقت ختم ہوئے جب کہ ان کے کھیت، باغ، زیورات سب بک گئے۔ ایک معمولی مینڈ کو پانے کے لئے دونوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔

یہی مینڈ کا جھگڑا ایک اور کسان کے ساتھ پیدا ہوا۔ مگر اس نے فوری اشتعال کے تحت کارروائی کرنے کے بجائے اس پر غور کیا۔ سمجھ دار لوگوں سے مشورے کئے۔ آخر کار اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ مینڈ کا جھگڑا مینڈ پر طے نہیں ہوتا۔ جھگڑے کو طے کرنے کی جگہ دوسری ہے۔ یہ سوچ کر اس نے جھگڑے کی مینڈ چھوڑ دی۔

اس نے یہ کیا کہ مسئلہ پر "آج" سے سوچنے کے بجائے "پیچھے" سے سوچنا شروع کیا۔ مینڈ کے واقعہ سے اس کے دل کو بھی چوٹ لگی۔ اس کو بھی اپنے نقصان اور اپنی بے بسی سے وہی تکلیف ہوئی جو ہر انسان کو ایسے وقت پر ہوتی ہے۔ مگر اس نے اپنے جذبات کو تھاما۔ فوری جوش کے تحت کارروائی کرنے کے بجائے سوچ سمجھ کر اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔

میرے حریف کو میری مینڈ پر قبضہ کرنے کی جرات ہی کیوں ہوئی، اس سوال پر غور کرتے کرتے وہ اس رائے پر پہنچا کہ اس کی وجہ حریف کے مقابلہ میں میری کمزوری ہے۔ میرا اور حریف کا اصل معاملہ مینڈ کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ میری پوزیشن میرے حریف کے مقابلہ میں اتنی زیادہ نہیں کہ وہ مجھ سے دبے اور میرے حقوق پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرے۔ ٹھنڈے ذہن سے سوچنے کے بعد اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اگر وہ اپنی طاقت اور حیثیت کو بڑھالے تو وہ زیادہ بہتر طور پر اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اس کے حریف کو اس کے اوپر دست اندازی کی جرأت ہی نہ ہوگی۔

اب اس نے اپنے کھیتوں پر پہلے سے زیادہ محنت شروع کردی۔ جو طاقت وہ حریف کو برباد

کرنے کی کوششوں میں لگاتا اس طاقت کو اس نے خود اپنی تعمیر میں لگانا شروع کر دیا۔ اس نئی فکر نے اس کے اندر نیا حوصلہ جگا دیا۔ وہ نہ صرف اپنے کھیتوں میں زیادہ محنت کرنے لگا بلکہ کھیتی کے ساتھ کچھ اور قریبی کاروبار بھی شروع کر دیا۔ اس کے نئے شعور کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کو از سر نو منظم کیا۔ وہ خرچ کو کم کرنے اور آمدنی کو بڑھانے کے اصول پر سختی سے عمل کرنے لگا۔ اسی کے ساتھ اپنے بچوں کو تعلیم کی راہ پر لگا دیا۔ اس نے طے کر لیا کہ اپنے ہر بچہ کو اعلیٰ مرحلہ تک تعلیم دلائے گا۔

اس دوسرے شخص کو بھی اپنی کوششوں میں اسی طرح ۲۰ سال لگ گئے جس طرح پہلے شخص کو ۲۰ سال لگے تھے۔ مگر پہلے شخص کے لئے ۲۰ سال بربادی کے ہم معنی تھا، جب کہ دوسرے شخص کے لئے ۲۰ سال آبادی کے ہم معنی بن گیا۔ اس ۲۰ سال میں اس کے بچے پڑھ لکھ کر اچھے عہدوں پر پہنچ چکے تھے۔ اس نے اپنی کھیتی اتنی بڑھا لی تھی کہ اس کے یہاں ہل بیل کے بجائے ٹریکٹر چلنے لگا تھا۔ جس کسان سے اس کا مینڈ کا جھگڑا ہوا تھا اس کا وہ پورا کھیت اس نے مینڈ سمیت خرید لیا۔

جس آدمی نے مینڈ کا جھگڑا مینڈ پر طے کرنے کی کوشش کی وہ تباہ ہو گیا۔ اس کے برعکس جس نے مینڈ کو چھوڑ کر دوسرے میدان میں مقابلہ کی کوشش کی وہ آخر کار نہ صرف مینڈ کا مالک بنا بلکہ حریف کا پورا کھیت اس کے قبضہ میں آ گیا۔

بجلی کا بلب جلتے جلتے بجھ جائے یا پنکھا چلتے چلتے رک جائے تو ہم بلب کو توڑ کر نہیں دیکھتے یا پنکھے سے نہیں الجھتے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بلب بجھنے اور پنکھا بند ہونے کی وجہ بلب اور پنکھے کے اندر نہیں ان کے باہر ہے۔ اور پھر جہاں سے فرق پڑا ہو وہاں درست کر کے اپنے بلب اور پنکھے کو دوبارہ چلا لیتے ہیں۔ انسانی معاملات بھی اکثر اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ بلب اور پنکھے کے معاملہ میں جو بات آدمی کبھی نہیں بھولتا اسی بات کو انسانی معاملہ میں ہمیشہ بھول جاتا ہے۔

آدمی کی یہ عام کمزوری ہے کہ جب بھی اس کی زندگی میں کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اسی مقام پر اپنا سر ٹکرانے لگتا ہے جہاں مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ کہیں پیدا ہوتا ہے اور اس کی وجہ کہیں ہوتی ہے۔ "حال" کا ایک واقعہ اکثر "ماضی" کے کسی واقعہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک معاملہ میں کسی کی زیادتی اکثر حالات میں کسی اور معاملہ میں پائی جانے والی ایک صورت حال کے سبب سے وقوع میں آتی ہے۔ ایسی حالت میں بہترین عقل مندی یہ ہے کہ آدمی جائے وقوع پر سر نہ ٹکرائے۔ بلکہ اصل سبب کو معلوم کر کے بات کو وہاں بنانے کی کوشش کرے جہاں بات بگڑ جانے کی وجہ سے اس کے ساتھ وہ حادثہ پیش آیا ہے جس میں وہ آج اپنے کو مبتلا پاتا ہے۔

قومی ترقی کا راز

قدرت کا یہ قانون ہے کہ مقناطیسی میدان اور حرکت کو یکجا کیا جائے تو وہاں جتنے تار ہوں گے سب میں الکٹران دوڑنے لگیں گے۔ جنریٹر اسی قانون قدرت کو استعمال کر کے بجلی پیدا کرتا ہے۔ اب اگر ایسا ہو کہ جنریٹر چالو کرنے کے بعد کسی تار میں الکٹران دوڑیں اور کسی تار میں نہ دوڑیں تو سارا تمدنی نظام درہم برہم ہو جائے۔ کیونکہ پھر بجلی پیدا کرنے کا عمل رک جائے گا۔ اور جب بجلی پیدا نہ ہوگی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری تمدنی مشین ٹھپ ہو کر رہ جائے گی۔

ایک چرواہا سیکڑوں بھیڑ بکریوں کو لے کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں چراتا ہے۔ بکریاں چرتے چرتے اونچی نیچی کھائیوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ مگر جب لوٹنے کا وقت آتا ہے تو چرواہا ایک جگہ کھڑا ہو کر آواز دیتا ہے اور اور اس کی ایک آواز پر تمام بھیڑ بکریاں اپنی اپنی جگہ سے نکل کر آواز کی طرف چل پڑتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں گلہ تیار ہو جاتا ہے اور چرواہا ان کو لے کر اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑتا ہے۔ اگر ایسا ہو کہ چرواہے کی آواز کے باوجود بھیڑ بکریاں اپنی اپنی جگہ پر بہری بن کر پڑی رہیں تو چرواہی اور گلہ بانی کا کام کرنا غیر ممکن ہو جائے۔

یہی اصول قوموں کے معاملہ میں بھی ہے۔ کسی قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ کوئی فکر اس کے افراد میں اس طرح اتر جائے کہ وہ پوری قوم کو متحرک کر سکے۔ گستاولی بان نے عربوں کا تاریخی مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

انسانی ترقی کا سب سے بڑا سبب کسی ایک تخیل کی پرستش ہے۔ یہ تخیل خواہ کوئی بھی ہو، اس قدر کافی ہے کہ وہ اتنا قوی ہو کہ قوم میں متحدہ احساس اور متحدہ امید پیدا کر دے۔ اور قوم کے ہر فرد کا اعتقاد اس کی نسبت اتنا زور آور ہو کہ وہ اس کے لئے اپنی جان دینے پر آمادہ ہو جائے۔ رومیوں کا تخیل شہر روم کی ترقی تھی۔ عیسائیوں کا تخیل عقبیٰ کا آرام حاصل کرنا تھا۔ موجودہ زمانہ میں بھی انسان نے نئے نئے معبود بنا لئے ہیں جو یقیناً فرضی ہیں مگر ان کے لئے وہ اتنے ہی مؤثر ہیں جتنا قدیم قوموں کے لئے ان کے معبود تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ محض ان حوادث کی ایک سرگزشت ہے جن کو انسان نے کسی تخیل کی تلاش میں طے کیا ہے۔ اگر یہ تخیل نہ ہوتا تو انسان ابھی تک وحشیانہ حالت میں ہوتا اور کسی قسم کا تمدن قائم نہ کر سکتا۔ قوم کا تنزل اسی دن سے شروع ہو جاتا ہے جس دن اس کے پاس کوئی ایسا تخیل نہ رہے جس کی حفاظت کے لئے ہر ایک فرد قوم اپنی جان دینے پر آمادہ ہو۔

عربوں نے ملک کے ملک فتح کئے۔ انھوں نے پہلے حکومت یونان و روم کے جانشینوں سے شکست کھائی۔ مگر وہ بالکل ہمت نہ ہارے۔ انھوں نے انھیں حریف قوموں سے فنون جنگ کو سیکھا۔ جب وہ فن جنگ میں ان کے برابر ہو گئے تو پھر وہ برابر کامیاب ہوتے رہے۔ ہر عرب سپاہی اس تخیل پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار تھا جس کے سایہ میں وہ لڑ رہا تھا۔ اس کے برعکس یونانیوں اور رومیوں کی فوج میں سارا جوش، سارا ولولہ اور سارے اعتقادات مدت دراز سے مر چکے تھے (تمدن عرب ۳۰ - ۶۲۹)

واقعات کے درمیان

آدمی کی زندگی میں روزانہ جو واقعات پیش آتے ہیں انھیں کے درمیان یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کیا ہے۔ ہر واقعہ ہمارے اندر کسی نہ کسی قسم کی ہلچل پیدا کرتا ہے اور ہماری نفسیات کسی نہ کسی صورت میں اس کا جواب پیش کرتی ہے، جو آدمی خدا کو بھولا ہوا ہے، اس پر جب کوئی واقعہ گزرتا ہے تو اس کا جواب اس کی خواہشات اور اس کے مفادات کے تابع ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے کہ جب اس کی زندگی میں کوئی واقعہ پیش آئے تو وہ خدا کو یاد کرے، وہ اس کے اندر نفسانیت کے جذبات کو نہ ابھارے بلکہ خدا پرستی کے جذبات کو ابھارے۔

زندگی میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ کبھی آرام ملتا ہے اور کبھی تکلیف۔ کبھی تعریف سننی ہوتی ہے اور کبھی تنقید۔ کبھی کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آتا ہے اور کبھی خوش گوار۔ یہ اتار چڑھاؤ سب امتحان کے پرچے ہیں۔ کامیابی یہ ہے کہ ان واقعات سے آدمی کے اندر نفسانیت نہ جاگے بلکہ خدا پرستی جاگے۔ خوشی اور آرام ہو تو اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے۔ کسی سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس کے اندر عجز اور عبدیت کی روح پیدا ہو۔

دنیا میں آدمی کا اصل امتحان یہی ہے کہ مختلف حالات کے درمیان وہ کس قسم کا جواب پیش کرتا ہے۔ دولت و اقتدار کے ملنے پر آدمی کے اندر اگر بڑائی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ ناکام ہو گیا اور اگر تواضع کا جذبہ پیدا ہو تو وہ کامیاب ہوا۔ کسی سے اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں ضد اور نفرت ابھر آئے تو وہ ناکام رہا اور اگر ہمدردی اور معافی کے احساسات ابھریں تو وہ کامیاب رہا۔ کسی سے معاملہ پیش آنے کی صورت میں اگر آدمی بے انصافی کرنے لگے تو وہ ناکام رہا اور اگر انصاف کے مطابق پورا پورا حق ادا کرے تو وہ کامیاب ہو گیا۔

انتخاب ہو رہا ہے

ہماری قریبی کہکشاں میں تقریباً دو سو ارب بہت بڑے بڑے ستارے ہیں اس قسم کی بے شمار کہکشائیں خلا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کائنات ناقابل قیاس حد تک وسیع ہے۔ تاہم ساری معلوم کائنات میں نظام شمسی صرف ایک ہے۔ اسی نظام شمسی میں زمین ہے۔ زمین جیسا کرہ ساری کائنات میں کوئی دوسرا نہیں۔ پھر زمین کے اوپر انسان جیسی انوکھی مخلوق ہے انسان کے اندر زندگی ہے۔ وہ چلتا ہے اور بولتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے۔ وہ سوچتا ہے اور جانتا ہے۔ وہ ذاتی ارادہ کے تحت عمل کرتا ہے۔ یہ انسان ایسی انوکھی چیز ہے جس کے انوکھے پن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اتنا انوکھا انسان اللہ نے کیوں بنایا۔ جواب یہ ہے کہ ـــــ ایک اور زیادہ انوکھی اور معیاری دنیا کے باسیوں کا انتخاب کرنے کے لئے جس کا نام جنت ہے۔

موجودہ دنیا ان مخلوقات کی دنیا ہے جو مجبورانہ اطاعت کر رہی ہیں، جو پابند ہو کر اللہ کی تابع ہیں۔ اب اللہ کو ایک ایسی مخلوق درکار ہے جو ارادی اطاعت کرنے والی ہو، جو پابند نہ ہو کر اس کی تابع ہو جائے۔ یہاں ایسے ہی افراد کا چناؤ ہو رہا ہے۔ اللہ کو ایسے لوگ مطلوب ہیں جو اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہو جائیں۔ جو اللہ کو نہ دیکھتے ہوئے اس کو دیکھنے لگیں۔ جو دنیا میں گھرے رہ کر آخرت والے بن جائیں۔ جو انکار اور سرکشی کا موقع رکھتے ہوئے اعتراف اور اطاعت کا طریقہ اختیار کر لیں یہاں جو افراد اس صلاحیت کا ثبوت دیں گے وہ اگلی زندگی میں جنتی دنیا میں بسائے جائیں گے۔ جنت انتہائی معیاری انسانوں کی انتہائی معیاری بستی ہوگی۔ وہ اتنی حسین اور لذیذ ہوگی کہ آدمی کبھی اس سے نہ اکتائے گا، وہاں نہ کوئی دکھ ہوگا اور نہ کوئی اندیشہ۔ وہاں انسان کے لئے وہ سب کچھ موجود ہوگا جو وہ چاہے۔

اللہ والے

ہر آدمی کسی نہ کسی چیز کے لئے جیتا ہے۔ کوئی اپنے بیوی بچوں کے لئے جیتا ہے۔ کوئی مال و دولت کے لئے اور کوئی عزت و اقتدار کے لئے۔ مگر اس قسم کی زندگی مومنانہ زندگی نہیں۔ مومنانہ زندگی وہ ہے جب کہ آدمی اللہ کے لئے جینے لگے۔ اس کی سرگرمیاں خدا کے گرد گھومنے لگیں۔ اس کی سوچ اور خواہش پر خدا کا غلبہ ہو جائے۔ وہ زبان کھولے تو یہ سوچ کر کھولے کہ خدا کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کو حرکت دے تو انھیں حدود میں حرکت دے جو خدا کی طرف سے اس کے لئے مقرر ہیں۔

آدمی کے سامنے کسی کی طرف سے ایک بات آتی ہے۔ اس کا نفس اس کے جواب کے لئے فوراً کچھ الفاظ سجھاتا ہے۔ مگر جو اللہ میں جینے والے ہیں وہ نفس کے دئے ہوئے الفاظ کو نہیں دہراتے بلکہ خدا سے الفاظ لے کر بولتے ہیں۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ کل جب میں خدا کے سامنے کھڑا ہوں گا تو وہاں کون سے الفاظ مانے جائیں گے اور کون سے الفاظ رد کر دئے جائیں گے۔ جن الفاظ کے متعلق اس کا ضمیر کہتا ہے کہ وہ خدا کے یہاں رد ہو جائیں گے ان کو وہ اسی دنیا میں رد کر دیتا ہے اور صرف ان الفاظ کو اپنی زبان پر لاتا ہے جو خدا کے یہاں قبول کئے جانے والے ہوں۔

اسی طرح آدمی کے سامنے ایک معاملہ آتا ہے۔ اس کا نفس فوراً اس کو ایک طریقہ کی ترغیب دیتا ہے۔ مگر اللہ میں جینے والا آدمی نفس کے بتائے ہوئے طریقہ پر نہیں دوڑ پڑتا بلکہ یہ سوچتا ہے کہ کون سا طریقہ خدا کی ترازو میں انصاف کا طریقہ ثابت ہوگا اور کون سا بے انصافی کا۔ وہ بے انصافی کے طریقے کو چھوڑ دیتا ہے خواہ اس میں اس کو عزت اور دولت ملتی ہو اور انصاف والے طریقے کو پکڑ لیتا ہے خواہ بظاہر اس میں سبکی ہوتی ہو اور دنیا کا نقصان ہوتا ہوا نظر آتا ہو۔ وہ ہر بات کو خدا کے لحاظ سے دیکھتا ہے نہ کہ کسی اور لحاظ سے۔

کمینہ پن نہیں

مومن غلطی کرسکتا ہے مگر وہ کمینہ پن نہیں کرسکتا۔ غلطی وہ ہے جو جذبات سے مغلوب ہوکر وقتی طور پر ہوجائے۔ پھر جب جذبہ ٹھنڈا پڑے تو آدمی کو اپنی غلطی کا احساس ہو۔ وہ شرمندہ ہو کہ مجھ سے ایسا کیوں ہوگیا۔ جس کے ساتھ غلطی ہوگئی ہے اس سے مل کر معافی مانگے۔ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے اور اگر عملی تلافی کی صورت نہ ہو تو وہ اس کے لئے دعا کرے۔ وہ اللہ سے کہے کہ خدایا تو میری غلطی کو معاف فرما اور میری طرف سے اس کے حق میں دعائے خیر لکھ دے۔ اس کو اپنی غلطی کا اتنا شدید احساس ہو کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں۔

کمینہ پن اس سے الگ چیز ہے۔ کمینہ پن محض وقتی جذبہ کے تحت نہیں ہوتا۔ وہ مستقل ذہن کے تحت ہوتا ہے، کمینہ آدمی کو اپنے کئے پر شرمندگی نہیں ہوتی، اس کے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے بلکہ وہ مقابل کے آدمی کو اور زیادہ تکلیف پہنچا کر خوش ہونا چاہتا ہے۔ کمینہ آدمی کو جب کسی سے شکایت ہوجاتی ہے تو وہ صرف اس سے بے تعلق ہوجانے کو کافی نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس پر جھوٹے الزام لگاتا ہے۔ وہ اس کے خلاف سازشیں کرتا ہے۔ اس کے اوپر جھوٹے مقدمے چلاتا ہے۔ اس کو اکھاڑنے اور اس کو برباد کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ وہ صرف اس کی غلطیوں کو غلطی کہنے پر قانع نہیں ہوتا بلکہ اس کی ہر چیز کو غلط ثابت کرنے میں لگ جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو اس کی طرف سے بدگمان کرتا ہے۔ وہ اس کے بنتے ہوئے کام کو بگاڑنا چاہتا ہے اور اس کے ملتے ہوئے فائدہ کو بھنگ کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے ——— یہ سب کمینہ پن کی صورتیں ہیں اور کمینہ پن اور خدا کا دین دونوں ایک ساتھ کسی شخص کے اندر جمع نہیں ہوسکتے۔

کمینہ پن یہ ہے کہ آدمی اعتراف نہ کرے۔ ایک ہی قسم کی صورت میں وہ اپنے لوگوں سے کچھ معاملہ کرے اور دوسرے لوگوں سے کچھ۔ وہ حسد اور انتقام سے اوپر اٹھ کر نہ سوچ سکے۔ ایسا آدمی خدا سے دور ہوتا ہے اور شیطان سے قریب۔

مومن کی دولت

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو خوش خبری دے دو کہ ایک دن آئے گا کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی۔ پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (توبہ ۳۵) یہ آیت اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا اب ہم کون سا مال جمع کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی بابت سوال کیا۔ آپ نے فرمایا:

لیتخذ احدکم قلبا شاکراً ولساناً ذاکراً وزوجۃ مومنۃ تعین احدکم علیٰ امر الآخرۃ (ابن ماجہ)

تم میں سے ہر شخص شکر کرنے والا دل اور یاد کرنے والی زبان کو اپنائے اور مومن بیوی کو جو آخرت کے معاملہ میں اس کی مدد کرے۔

دولت وہی ہے جو زندگی کے مسائل میں کام آئے۔ مومن کے لئے سب سے بڑا مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہوتا ہے، اس لئے وہ اسی چیز کو دولت سمجھتا ہے جو آخرت میں کام آنے والی ہو۔ آخرت میں جو چیز آدمی کے کام آئے گی وہ یہ کہ دنیا میں وہ اس طرح رہے کہ ہر حال میں وہ اللہ کا شکر کرنے والا ہو۔ اس کا دل اس طرح اللہ میں اٹکا ہوا ہو کہ ہر وقت اس کو اللہ کی یاد آتی رہے۔ جو شخص اپنے لئے آخرت والی زندگی پسند کرے وہ اپنی زندگی کا ساتھی بھی کسی آخرت پسند کو بنائے گا۔ ایسے آدمی کے لئے ایسی ایک بیوی بہت بڑی دولت ہے جو دنیا کے بجائے آخرت کو چاہتی ہو۔ جو اس کو دنیا کی وقتی چیزوں کی طرف کھینچ کر نہ لے جائے بلکہ اس کو آخرت کی طرف چلنے میں مدد دے۔

لوگ سونا چاندی کو دولت سمجھتے ہیں۔ مگر مومن کی دولت خدا ہے۔ وہ ان چیزوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے جو اس کو خدا سے قریب کرنے والی ہوں۔ جو بعد کو آنے والی دنیا میں اس کو خدا کی رحمتوں کا مستحق بنائیں۔

حالات کا لحاظ ضروری

خالد بن ولید رضؓ اسلامی فوج کے سب سے بڑے سپہ سالار اور فاتح تھے۔ مگر ۱۷ھ میں عین فتوحات کے زمانہ میں خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضؓ نے ان کو معزول کر دیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ خالد بن ولید رضؓ اپنی جرأت اور دلیری کی وجہ سے بعض اوقات ایسے اقدام کر دیتے تھے جس کے لئے پہلے سے پوری تیاری نہ کی گئی ہو۔ چنانچہ محاصرۂ حمص (۱۷ھ) میں جب کہ ہرقل اہل جزائر سے متفق ہو کر حمص پر حملہ آور ہوا تو خالد بن ولید مرکز خلافت کی ممانعت کے باوجود قلعہ سے باہر نکل آئے اور فوری جنگ پر تیار ہو گئے۔ اطراف و جوانب سے جو اسلامی کمک آنے والی تھی، اس کا انتظار نہیں کیا۔ حضرت عمر رضؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس اقدام کو سخت ناپسند فرمایا۔

شاہ ولی اللہ صاحب اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اگرچہ اس لڑائی میں اللہ کا فضل شامل حال رہا اور تائید الٰہی سے فتح حاصل ہوئی۔ (مگر اس قسم کا اقدام احتیاط کے خلاف تھا) کیونکہ ایسی صورتوں میں بلا امداد لئے ہوئے جرأت کر کے جنگ میں کود پڑنا بعض اوقات شکست کا باعث ہوتا ہے، (ازالۃ الخفاء)

معاملہ کے وقت راز داری کی قسم

ہجرت کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ نے راستہ کی رہنمائی کے لئے قبیلہ بنو الدیل کے ایک مشرک کی خدمات اجرت پر حاصل کیں۔ اس کا نام عبد اللہ بن اریقط تھا اور وہ حجاز کے راستوں کا ماہر تھا۔ اس شخص نے عرب دستور کے مطابق پانی کے پیالے میں انگلیاں ڈال کر قسم کھائی کہ وہ راز داری کے ساتھ کام کرے گا۔ اس نے معروف شاہراہ کو چھوڑ کر ساحلی راستہ سے آپ کو مدینہ پہنچایا (قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین)

جواب نہ دینا بہادری کے خلاف نہیں

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ غزوۂ احد کے بعد جب مسلمانوں کی جماعت منتشر ہو گئی تو قریش کے سردار ابوسفیان نے قریب آکر آواز دی: کیا تم میں محمدؐ موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ نے فرمایا "جواب مت دو" اس کے بعد ابوسفیان نے آواز دی "کیا تم میں ابن ابی قحافہ موجود ہیں" آپ نے فرمایا "چپ رہو" پھر ابوسفیان نے پکار کر کہا "کیا تم میں ابن خطاب موجود ہیں"۔ آپ نے فرمایا چپ رہو، کوئی جواب مت دو۔ جب تین بار جواب نہیں ملا تو ابوسفیان نے کہا "بلاشبہ یہ سب مارے گئے، اگر وہ زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے" عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر ضبط نہ کر سکے اور فرمایا "اے اللہ کے دشمن تو نے جھوٹ کہا۔ اللہ تجھ کو ذلیل ہونے کے لئے زندہ رکھے (بخاری)

سوال بدل کر حقیقت معلوم کرلی

مسلمان جنگ بدر کے لئے کوچ کر رہے تھے۔ راستہ میں مکہ کے دو آدمی نظر آئے۔ ایک قریشی اور دوسرا غلام مسلمانوں نے پکڑنے کی کوشش کی۔ قریشی بھاگ گیا اور غلام کو گرفتار کر لیا گیا۔ لوگوں نے غلام سے مکہ کی فوج کی تعداد پوچھی جو مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہی تھی۔ اس نے جواب میں کہا: ان کی تعداد بہت ہے اور ان کی طاقت بڑی ہے"

سختی کرنے پر بھی اس نے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔ اس کے بعد اس غلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ آپ کے سوال پر بھی اس نے اپنے اسی سابقہ جملہ کو دہرایا: "ان کی تعداد بہت ہے اور ان کی طاقت بڑی ہے"۔ آپ نے کوشش کی کہ وہ دشمن کی صحیح تعداد بتائے۔ مگر وہ راضی نہ ہوا۔ آخر آپ نے اپنے سوال کو بدل دیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: "وہ لوگ روزانہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں"۔ غلام نے کہا "دس اونٹ" آپ نے فوراً کہا: اس حساب سے دشمن کی فوج کی تعداد ایک ہزار ہے۔ کیونکہ ایک اونٹ ایک سو آدمیوں کی خوراک کے لئے کافی ہوتا ہے"۔

وہ کام نہ کرو جو تمہارے بس کا نہ ہو

خلیفہ ثانی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ۱۳ سو برس پہلے فرمایا: جس نے بھیڑئے کی چرواہی کی اس نے ظلم کیا (من استرعی الذئب ظلم، ابن مردویہ عن ابن عمر)

معاملات میں صرف نیک نیت ہونا کافی نہیں

جنگ جمل (۳۶ھ) زوروں پر تھی۔ دونوں طرف مسلمانوں کی لاشیں میدان میں گر رہی تھیں۔ حضرت عائشہؓ اگرچہ جنگ جمل میں شریک تھیں مگر وہ مقام جنگ سے بہت دور تھیں۔ کعب بن سور مسلمانوں کے خون سے پریشان تھے۔ وہ حضرت عائشہ کے پاس آئے اور کہا کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے اونٹ پر سوار ہو جائیں اور میدان جنگ کی طرف چلیں۔ ممکن ہے کہ آپ کی سواری کو دیکھ کر لوگ جنگ سے رک جائیں اور صلح کی صورت پیدا ہو جائے۔ حضرت عائشہ خود بھی باہمی کشت و خون سے پریشان تھیں وہ فوراً راضی ہو گئیں اور اپنے اونٹ پر سوار ہو گئیں۔ آپ کے ہودج کے چاروں طرف لوگوں نے احتیاط کی غرض سے زرہیں پھیلا دیں۔ اور ان کے اونٹ کو لا کر ایسے مقام پر کھڑا کر دیا جہاں سے پورا لشکر ان کو دیکھ سکتا تھا۔ مگر نتیجہ امید کے بالکل خلاف نکلا۔ لڑائی کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی۔ لوگ سمجھے کہ ام المومنین بہ نفس نفیس میدان جنگ میں آگئی ہیں اور ان کو بہادری کے ساتھ لڑنے کی ترغیب دے رہی ہیں۔ اس طرح ان کی موجودگی مزید اشتعال و اشتداد پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔ حضرت عائشہ کا اونٹ مسلمانوں کے کشت و خون کا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ حضرت علی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس اونٹ کو مار کر گرا دو۔ جب تک یہ اونٹ نہیں گرے گا جنگ نہیں رک سکتی۔

کبھی بولنے کے بجائے چپ رہنا ضروری ہوتا ہے

احد کی جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر ایک گڑھے میں گر گئے۔ مشہور ہو گیا کہ آپ قتل ہو گئے (ان محمدا قد قتل) مسلمان کہنے لگے کہ جب آپ قتل ہو گئے تو اب ہم کس پر لڑیں (علام نقاتل اذا کان محمد قد قتل) اس دہشت میں سب سے پہلے جس نے آپ کو گڑھے میں دیکھا وہ کعب بن مالک انصاری تھے۔ وہ پکار اٹھے: اے مسلمانوں کے گروہ تم کو خوش خبری ہو (یا معشر المسلمین ابشروا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ چپ رہو (فاشار الیہ الرسول ان اصمت)

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیار اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا، بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

۱-	الاسلام	از مولانا وحید الدین خاں		۱۵—۰۰
۲-	مذہب اور جدید چیلنج	..	〃	۱۵—۰۰
۳-	ظہور اسلام	..	〃	۱۵—۰۰
۴-	دین کیا ہے	..	〃	۲—۰۰
۵-	قرآن کا مطلوب انسان	..	〃	۵—۰۰
۶-	تجدید دین	..	〃	۳—۰۰
۷-	اسلام دین فطرت	..	〃	۳—۰۰
۸-	تعمیر ملت	..	〃	۳—۰۰
۹-	تاریخ کا سبق	..	〃	۳—۰۰
۱۰-	مذہب اور سائنس	..	〃	۵—۰۰
۱۱-	عقلیات اسلام	..	〃	۳—۰۰
۱۲-	فسادات کا مسئلہ	..	〃	۲—۰۰
۱۳-	انسان اپنے کو پہچان	..	〃	۱—۰۰
۱۴-	تعارف اسلام	..	〃	۲—۵۰
۱۵-	اسلام پندرھویں صدی میں	..	〃	۲—۰۰
۱۶-	راہیں بند نہیں	..	〃	۳—۰۰
۱۷-	دینی تعلیم	..	〃	۳—۰۰
۱۸-	ایمانی طاقت	..	〃	(زیر طبع)
۱۹-	اتحاد ملت	..	〃	
۲۰-	سبق آموز واقعات	..	〃	
۲۱-	اسلامی تاریخ سے	..	〃	
۲۲-	قال اللہ	..	〃	
۲۳-	اسلامی دعوت	..	〃	۳—۰۰
۲۴-	زلزلۂ قیامت	..	〃	۴—۰۰
۲۵-	سچا راستہ	..	〃	۱—۰۰

عربی مطبوعات

مولانا وحید الدین خاں کی کتابوں کے بعض عربی ترجمے (طبع قاہرہ) بسلسلۂ فروخت مکتبہ الرسالہ میں موجود ہیں:

۱ - الإسلام يتحدى	۲۶۳	صفحات	قیمت	۲۰	روپے
۲ - الدين في مواجهة العلم	۱۱۲	صفحات	〃	۱۰	روپے
۳ - حكمة الدين	۸۷	صفحات	〃	۸	روپے
۴ - الإسلام والعصر الحديث	۷۷	صفحات	〃	۸	روپے
۵ - مسئوليات الدعوة	۳۹	صفحات	〃	۲	روپے
۶ - نحو تدوين جديد للعلوم الإسلامية	۲۶	صفحات	〃	۲	روپے
۷ - إمكانات جديدة للدعوة	۳۴	صفحات	〃	۲	روپے
۸ - الشريعة الإسلامية وتحديات العصر	۳۲	صفحات	〃	۲	روپے
۹ - المسلمون بين الماضي والحال والمستقبل	۶۲	صفحات	〃	۵	روپے
۱۰ - نحو بعث إسلامي	۳۲	صفحات	〃	۵۰	پیسے

دینی تعلیم

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۴۸ قیمت ۲/- روپے

ہمارا سفر(؟)

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۱۶ قیمت ایک روپیہ

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نیو کمرشل پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

REGD. NO. D. (DN) 532
REGD. R. N. NO. 28822/76

JULY 1981
ISSUE NO. 56

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231